مثنویاتِ حالی

شیخ مبارک علی تاجر و ناشر کتب
اندرون لوہاری دروازہ ۔ لاہور

مصنف : خواجہ الطاف حسین حالی
مقدمہ : مرتضیٰ حسین فاضل

مثنویاتِ حالی

شیخ مبارک علی ناشر و تاجر کتب
اندرون لوہاری دروازہ لاہور پاکستان

سلسلہ اشاعت : ۱۸۰
ناشر : احمد علی شیخ (مالک و مہتمم ادارہ)
مطبع : مظفر پرنٹرز، گنپت روڈ، لاہور
تعداد : ۱۰۰۰
اشاعت اوّل : ۱۹۶۶ء ، ماہ نومبر
قیمت : چھ روپے

فہرس

حالی ـــــــ سوانح

حالی مشاغلِ زندگانی

حالیؔ ——— فکر و فن

حالی کی نیچرل شاعری

حالیؔ ——— مثنویات

مقدمہ

حالی

نئی شاعری کا بانی

سوانح — فکر و فن

مرتضیٰ حسین فاضل

حالی — سوانح

خواجہ الطاف حسین حالی اُردو ادب کے نئے باب کا حرفِ اوّل ہیں۔ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ نظریاتی اور تحلیلی تنقید کا آغاز ہے۔ حالی برِصغیر کی علمی نہضت جدید اور ذہنی روایت کے محرکین میں صفِ اوّل کے رہنما ہیں۔ وہ اعلیٰ درجہ کے انسان، اعلیٰ درجہ کے ادیب، اعلیٰ درجہ کے قومی نقیب ہیں۔

خواجہ صاحب نقاد اور سوانح نگار کے علاوہ قدیم و جدید شاعری کی درمیانی کڑی ملانے والے شاعر بھی ہیں۔ نثر میں اُن کا پایہ بلند ہے اور نظم میں اُن کا مرتبہ ارجمند ہے۔ قوم کے غمگسار، ملت کے ہمدرد، زوال کے مرثیہ خواں، عروج کیلئے دُعاگو تھے۔ ہمت آفرینی کا پیغام رکھتے تھے۔ باعمل کردار کے مالک تھے۔ اُنہوں نے زبان و بیان کو نئے نغمے اور نئے پیرائے بخشے۔

نیچرل شاعری کے اوّلین معماروں میں وہ بہت بڑے معمار تھے۔ اسلامی شاعری اور مسلمانوں کو موضوع و مخاطب بنانے والوں میں وہ سب کے پیشرو تھے۔

اِس مختصر سی گفتگو میں ہم اُن کے حالات اور فن کے بعض پہلوؤں کا جائزہ لیں گے اور دیکھیں گے کہ حالی کی شخصیت خود کیا تھی اور اُنہوں نے مسلمانوں کے لئے کیا کیا؟ وہ کس قسم کا اثر چھوڑ گئے ہیں اور اُن کی شاعری میں سب سے نمایاں خوبی کیا ہے

وہ کس ماحول میں اُبھرے، ماحول نے اُن پر کیا اثر ڈالا اور اُنہوں نے ماحول کو

متاثر کرنے میں جو ... کی وہ آج تک قابل قدر کیوں ہے۔

حالی کا وطن

دہلی سے ترپن میل شمال کی طرف بڑھیے تو پانی پت (ضلع کرنال) کا مشہور قصبہ ملتا ہے۔ بوعلی شاہ قلندر کی زیارت گاہ نے برصغیر میں اُسے بہت محترم بنا دیا ہے۔ تاریخی لحاظ سے بھی ہندوستان میں مغربی راستوں سے آنے والے حملہ آوروں کے لئے متعدد بار میدان جنگ بن چکا ہے۔ بابر کا معرکۂ پانی پت، احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کا خونریز مقابلہ پانی پت ہی میں ہوا۔ گویا پانی پت کی شہرت تین عظیم اسباب کی بنا پر ہے:

ا۔ میدانِ جنگ

ب۔ مزار بوعلی قلندر

ج۔ حالی کا وطن

پانی پت عہدِ قدیم سے آباد قصبہ چلا آرہا ہے۔ مسلمانوں کے ابتدائی دورِ حکمرانی سے یہاں اسلامی علوم کا چرچا تھا۔

حالی کا خاندان

پانی پت میں ہندوؤں کی بہت بڑی آبادی تھی۔ مسلمانوں کی آبادی قدرے کم ضرور تھی، لیکن تاریخی طور پر اعزاز اور معاشرتی برتری کے مالک یہی تھے۔ کہتے ہیں اب سے سات آٹھ سو برس پہلے سے پانی پت میں مسلمانوں کا ایک خاندان آباد چلا آرہا ہے۔ یہ خاندان چونکہ صحابیِ رسولؐ حضرت ابوایوب انصاریؓ کی اولاد میں ہے اس لیے پورے خاندان کو انصاری کہتے ہیں۔ حضرت ابوایوب کی اولاد میں شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری[1] بہت مشہور ہوئے۔ پھر اُن کی نسل میں خواجہ ملک علی پیرِ ہرات نے

---

[1] متوفی ۹ ربیع الاول سنہ ۴۸۱ھ

شہرت پائی۔ یہی پیر ہرات ملک علی ہندوستان آئے۔ اپنی قابلیت اور صفات ذاتی کی بنا پر قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے گئے۔ اور بادشاہ نے قاضی شریعت، خطابت عیدین، تولیت مزارات، دینی معاملات کی صدارت اور بازار کی قیمتوں کی نگرانی جیسے عہدے عطا کئے۔ اور مددِ معاش کے لئے عمدہ اور سیر حاصل دیہات پرگنہ پانی پت میں اور معتد بہ اراضی سواد قصبہ پانی پت میں دینے کے علاوہ قصبہ کے اندر رہائش و تعمیر مکانات کے لئے زمین دی۔ (تذکرہ حالی از حالی)

پانی پت کا محلہ انصاریاں اسی وقت سے آباد چلا آرہا ہے۔ گویا عہد غیاث الدین (متوفی ۶۸۵ھ/ ۱۲۸۶ء) یعنی ساتویں صدی ہجری میں حالی کے اجداد پانی پت میں آئے یہ بزرگ امارت و عزت کے مالک تھے۔ مولانا حالی کہتے ہیں:

"خواجہ ملک علی نام، جو علوم متعارفہ میں اپنے معاصرین میں ممتاز تھے، ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے جن کا سلسلہ نسب ۲۸ واسطوں سے حضرت ابو ایوب انصاری تک اور ۱۸ واسطے سے شیخ الاسلام تک اور دس واسطے سے ملک محمود شاہ انجو[1] معروف بہ آل خواجہ تک۔ جو غزنوی دور میں فارس اور کرمان و عراق عجم کا فرماں روا تھا۔ پہنچتا ہے۔ چونکہ غیاث الدین اس بات میں نہایت مشہور تھا کہ وہ قدیم اشراف خاندان کی بہت عزت کرتا تھا اور اس کا بیٹا سلطان محمد علماء و

---

[1] یہ بات بحث طلب ہے کہ محمود شاہ انجو کون تھا اور یہ خاندان غزنوی دور میں حکمران تھا یا نہیں کہا تو یہی جاتا ہے کہ یہ لوگ آل مظفر کہلاتے تھے اور فارس، کرمان و کردستان کے حکمران تھے ۷۱۳ھ ۷۹۵ھ تک اُن کی حکومت رہی۔ تیمور نے ان کو شکست دی تھی۔ مولانا حالی انہیں غزنویوں کا معاصر بتاتے تھے۔ حالانکہ تاریخ میں انجو کا ذکر غیاث الدین بلبن کے بعد اور تیمور کے زمانے سے ملتا ہے۔ مرتضیٰ حسین

شعرا و دیگر اہل کمال کا حد سے زیادہ قدردان تھا۔ اس لئے
اہل علم اور عالی خاندان لوگ ایران و ترکستان سے ہندوستان
کا قصد کرتے تھے"۔

اس خاندانی اعزاز سے انصاریوں نے پانی پت میں دولت مندی اور علمی نیک نامی سے زندگی بسر کی، زمانے کی گردشوں نے ان لوگوں کو غریب کیا۔ دولت تقسیم ہو گئی، کوئی زمیندار بن گیا۔ کوئی نان شبینہ کو ترسنے لگا۔

حالی کے والدین

خواجہ ایزد بخش انصاری پانی پت کے پریشان حال گھر سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے آخری حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بقول حالی سررشتہ پرمٹ اور بقول حامد حسن قادری محکمہ نمک میں ملازم تھے۔ اُن کی اہلیہ پانی پت ہی کے ایک سید خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور دونوں کے دونوں شیعہ تھے۔

(نقوش، شخصیات نمبر صفحہ ۵۳)

خواجہ ایزد بخش کی اولاد کا حال تفصیل سے معلوم نہیں، ہاں خود مولانا کے بیان میں "بھائی بہنوں" کے لفظ سے خیال ہوتا ہے کہ ان کی متعدد اولادیں تھیں جس میں ایک سے زیادہ لڑکیاں ہوں گی۔ اور کچھ لڑکے بھی۔ لیکن ان میں سے خواجہ امداد حسین مظہر کے علاوہ ہمیں کوئی نام معلوم نہیں۔ مظہر صاحب کا حالی سے بزرگانہ اور مربیانہ تعلق رہا ہے۔ دیوان میں خواجہ مظہر صاحب کی وفات پر مرثیہ و تاریخ موجود ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف نے ۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۵ء میں رحلت کی تھی۔

حالی کی ولادت و تربیت

خواجہ ایزد بخش کے گھر میں (غالباً) ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں خواجہ

الطاف حسین کی ولادت[1] ہوئی۔

غریب ماں باپ اور پریشان حال گھرانے میں فرزند کے پیدا ہونے کی خوشی تو منائی گئی لیکن بچے کی بدنصیبی کہ چاہنے والی ماں دماغی توازن سے محروم ہو گئیں۔ زندگی کی ابتدائی منزلوں میں شفقت مادری سے دُوری نے خدا جانے حالی پر کیا کیا ستم ڈھائے۔ مولانا حالی نے خود لکھا ہے کہ وہ اپنے بڑے بھائی[2] اور بہنوں کی آغوش تربیت میں چلے گئے۔ ان بزرگوں نے اپنی بساط بھر نگہداشت اور پرورش کی۔

ماں باپ کی براہِ راست سرپرستی سے محروم حالی ابھی نو برس کا ہوا تھا کہ بوڑھے باپ نے رحلت کی۔ اس طرح ۱۸۴۳ء میں حالی یتیم ہو گئے۔

شعور کا آغاز ہوتے ہی حالی نے اپنی محرومی و ناکامی کا نقشہ دیکھا۔ نفسیات کے شعور و لاشعور کو ہمیشہ کے لئے متاثر کرنے والے حالات نے خواجہ صاحب کی زندگی پر دُور رس نقش قائم کئے۔

تعلیم

خواجہ امداد حسین اور معاون عزیزوں نے ابتدائی تعلیم میں مدد کی۔ ابجد خوانی کے بعد قاری ممتاز علی صاحب وامادِ میر مضمون کے مکتب میں جانے لگے۔

قاری صاحب دہلی کے رہنے والے تھے، سسرال والوں کی خاطر پانی پت میں بودو باش اختیار کر لی تھی۔ فارسی کے عالم اور فن طب کے ماہر تھے۔ تعلیم و تدریس سے

---

[1] مولانا حالی نے اپنی ولادت "تقریباً ۱۸۳۷ء" بتائی ہے یعنی خود مولانا صحیح و معین طور پر اپنی تاریخ پیدائش نہیں بتا سکے۔ بعض حضرات نے "تقریباً" کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا اور ۱۸۳۷ء کو حتمی تاریخ ولادت مان لیا۔ بعض حضرات نے ۱۸۳۷ء کو ۱۸۳۶ء لکھ دیا ہے (تلامذہ غالب) حالانکہ جنتری میں ۱۲۵۳ھ (بیان حالی) ۱۸۳۸-۳۷ء کے مطابق ہے۔

[2] مالک رام صاحب کے بقول بڑے بھائی اور بڑی بہن ——— فاضل

دلچسپی تھی۔ کچھ لڑکے محلّے اور قصبے کے پڑھنے آجایا کرتے تھے۔ جس میں سے ایک حالی بھی تھے۔

حالی نے قاری صاحب سے قرآن مجید حفظ کیا۔ دو چار کتابیں فارسی کی پڑھیں اور اس زبان و ادب سے دلچسپی پیدا کی۔

انہی دنوں پانی پت کے مشہور عالم و واعظ مولانا حاجی ابراہیم حسین صاحب انصاری (متوفی ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۱ء) لکھنؤ سے فراغت تعلیم کے بعد وطن پہنچے تھے۔ حالی نے ان عربی پڑھنے کا فیصلہ کیا اور صرف و نحو کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ کچھ دنوں تک عربی گرامر میں ان سے فیض اٹھایا۔

تقریباً پندرہ سولہ برس کی عمر میں بقدر ضرورت فارسی، اور عام کاروبار کے مطابق لکھنا پڑھنا آگیا تھا۔ والدین کے قائم مقام بھائی بہنوں نے ایک خوشحال گھرانے میں رشتہ تلاش کر لیا، ان کی رائے میں حالی کو اپنا بوجھ خود اٹھانا چاہیئے تھا۔ وہ لوگ اپنے فرائض سے سبکدوشی چاہتے تھے۔ اُن کے حالات اجازت نہ دیتے تھے کہ بھائی کو مزید پڑھائیں لکھائیں، پھر رسم و رواج کے مطابق پندرہ برس کے لڑکے کی شادی بھی ہو جانا چاہیئے تھی، ورنہ لوگ طعنے دیتے۔ مگر حالی کو پڑھنے اور بڑھنے کی فکر تھی۔ حالی نے بہت کوشش کی اور اس بندھن سے بچنے کی تدبیریں سوچیں مگر مجبور تھے، شادی تو ہو گئی لیکن حالی بیوی کو میکے میں چھوڑ کر ۱۸۵۴ء میں تحصیل علم کے لئے دہلی پہنچ گئے۔

ان دنوں دہلی کے ادبی حلقوں میں مومن، ذوق، صہبائی، آزردہ —— اور غالب کا طوطی بول رہا تھا۔ مومن و ذوق کو مرے ہوئے ابھی زیادہ نہیں گزرے تھے۔ غالب اُستاد بادشاہ کی حیثیت سے معزز اور فارسی و اُردو کے صاحب طرز ادیب و شاعر کی حیثیت سے انتہائی شہرت و عروج پر جارہے تھے۔

مدارس میں نیا مدرسہ یعنی "دلی کالج" سب سے زیادہ اہم تھا جہاں نئی روشنی کے نوجوان نئے انداز کی تعلیم حاصل کرنے جاتے اور شہر میں عزت پاتے تھے۔ محمد حسین آزاد، ذکاء اللہ، نذیر احمد جیسے حضرات یہاں پڑھ رہے تھے۔ مگر حالی کے بزرگ نئی تعلیم کے مخالف تھے۔

لہذا حالی کو پرانے طرز کا مدرسہ ڈھونڈنا پڑا۔ اتفاق سے خود مولانا کے ضلع کرنال کے مولوی[1] نوازش علی صاحب حسین بخش سوداگر کے مدرسے میں مدرس تھے۔ لہذا حالی مولانا ہی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور موصوف ہی کے مدرسے میں رہنے لگے۔ مولوی نوازش علی صاحب صرف مدرس ہی نہ تھے بلکہ دہلی میں اُن کی تقریر عوام و خواص کو بہت پسند تھی۔ حالی نے منطق میں ملا حسن کی شرح سلم العلوم اور فلسفہ میں میبذی اعلیٰ درجے کی کتابیں یہیں پڑھیں۔ ظاہر ہے کہ صرف و نحو میں شرح ملا جامی، سیوطی، ابن عقیل اور المغنی میں سے کوئی کتاب بھی پڑھی ہوگی۔

مولانا فیض الحسن سہارنپوری، مولانا نذیر حسین محدث اور امیر احمد صاحب عربی ادب و حدیث و فقہ کے مشہور اُستاد تھے۔ مالک[2] رام کہتے ہیں کہ حالی نے ان بزرگوں سے بھی تعلیم حاصل کی۔

ذہانت اور قابلیت، عربی دانی اور علوم متداولہ میں اُن کی صلاحیتوں کا اندازہ لگانے کے لئے یہی کافی ہے کہ اُنھوں نے منطق کے کسی اختلافی مسئلہ پر نواب صدیق حسن خاں کی حمایت میں ایک رسالہ لکھا تھا۔ رسالے کی زبان عربی تھی۔ اُستاد نے رسالہ دیکھ کر یہ نہیں کہا کہ رسالہ مہمل اور بحث بے معنی ہے۔ بلکہ یہ کہا کہ اس سے ایک[3] وہابی کی حمایت ہوتی ہے۔ گویا حالی عربی لکھنے اور مسائل پر رائے دینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اُنہیں تصنیف و تالیف کا شوق کم سنی ہی میں تھا۔

مالک رام اور سرشری رام کے بقول حالی نے اس زمانے میں غالب سے بھی فیض اُٹھایا

---

[1] مالک رام کہتے ہیں کہ مولوی نوازش علی صاحب سے سرسید نے بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس لئے حالی اور سرسید خواجہ تاش اور بھائی بھائی تھے۔ (تلامذۂ غالب صفحہ ۸۴)

[2] تلامذۂ غالب۔

[3] خواجہ غلام الحسنین: حالی: نقوش، شخصیات نمبر صفحہ ۲۸۔

[4] خمخانۂ جاوید جلد ۲ صفحہ ۲۵۵۔ تلامذہ غالب۔

تھا، وہ غالب سے خود ان کے فارسی قصائد پڑھنے جاتے اور غالب کے ساتھ قلعہ کے مشاعروں میں شریک ہوتے تھے اور خود بھی شعر و شاعری شروع کر دی تھی۔
دلی میں ڈیڑھ برس ہی گزرا تھا کہ گھر والوں نے اصرار کر کے واپس بلا لیا۔ گھر آن کر دیکھا تو حالات ایسے تھے کہ انہیں کلکٹری میں معمولی سی تنخواہ پہ نوکری کے لئے حصار جانا پڑا۔ لیکن نوکری کے سال ڈیڑھ سال بعد غدر کا ہنگامہ ہو گیا۔ اور مولانا حصار سے پھر پانی پت آ گئے اور چار سال تک مستقل طور پہ پانی پت ہی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں مصروف رہے۔

> "اس عرصے میں پانی پت کے مشہور فضلا، مولوی عبدالرحمٰن، مولوی محب اللہ اور مولوی قلندر علی مرحوم سے بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ، کبھی حدیث، کبھی تفسیر پڑھتا رہا اور جب ان صاحبوں میں سے کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا اور خاص کر علم و ادب کی کتابیں شرح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھتا تھا اور کبھی کبھی عربی نظم و نثر بھی بغیر کسی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا۔ مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا۔" (خود نوشت)

مولانا کی متعدد اور متنوع کتابیں دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت وسیع النظر آدمی تھے۔ عربی ادب کی تاریخ، نظم و نثر عربی و فارسی پر عبور رکھتے تھے۔
مقدمہ شعر و شاعری میں عربی و فارسی کلاسیکل کتابوں کے حوالے اور شعر عرب و ایران کی فراوانی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکثر اساتذہ کے دیوان بڑی گہری نظر سے دیکھتے تھے۔
فارسی ادب و تاریخ میں حیات سعدی اور سوانح حکیم ناصر خسرو اگرچہ آخری زمانے کی کتابیں ہیں مگر جوانی کے معلومات کی نقاب کشائی بھی کرتی ہیں۔
عربی فارسی کے اشعار اور نثر کے نمونے ثابت کرتے ہیں کہ انہیں ان زبانوں پہ اچھی خاصی دسترس تھی۔

فقہ میں اُن کی تعلیم کا حال نہیں کُھلتا مگر منطق و فلسفہ، حدیث و قرآن، ادب و تاریخ، میں اُن کی قابلیت بہرحال ثابت ہے۔ مسدّس میں تاریخ کے حوالے گواہ ہیں کہ ہندوستان اور ایران و عرب کے حالات و واقعات اُن کے سامنے ہیں اور تاریخ اسلام سے انہیں عالمانہ واقفیت ہے۔

ذہانت اور تجدّد، ذکاوت اور قوتِ استنباط و تنقید کا جائزہ تصنیفات کی ذیل میں آئے گا۔ سردست یہ فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ حالی مدرسے کے متداول نصاب کے فاضل اور تکمیل کی فضیلت رکھتے تھے۔

شادی پرانے رسم و رواج کے مطابق اور گھریلو مجبوریوں کے سبب سے بھائی اور بہن نے (جن کو حالی والدین کی جگہ مانتے تھے) شادی پر مجبور کیا ابتک بھائی کی نوکری پر گھر کا گزارہ تھا۔ حالی نے بھی مصلحت دیکھی اور سترہ سال کی عمر میں شادی پر مجبوری کے ساتھ رضامندی دے دی۔ آخر قصبے کے آسودہ حال بزرگ سید باقر علی صاحب کی صاحبزادی اسلام النساء سے ۱۸۵۵ء میں عقد ہو گیا۔ حالی کو شادی کے بعد نسبتاً اچھا ماحول مل گیا۔ بھائی بہنوں کی خواہش پوری ہو گئی۔ ان کی فکر ختم ہو گئی اور مولانا کو ایسی نیک مزاج رفیقۂ حیات ملی جسکی وجہ سے سال ڈیڑھ سال دلّی میں پڑھتے لکھتے رہے، پھر ایک معمولی ملازمت اور سال ڈیڑھ سال کے چکر کے بعد جب چار سال تک حرم کے گھر میں رہنے کا موقع ملا تو پڑھنے اور تکمیل علوم کے لئے بڑی رکاوٹ پیدا نہ ہوئی۔

اولاد اُن کے دو فرزندوں اور ایک ایسی صاحبزادی کا علم ہے جن کی اولاد ابھی تک ماشاء اللہ باقی ہے۔

۱۔ خواجہ اخلاق حسین، جن کی صاحبزادی مشتاق فاطمہ آنریبل خواجہ غلام الثقلین کی اہلیہ، اور خواجہ غلام السیدین اور صالحہ عابد حسین کی والدہ تھیں۔

۲۔ خواجہ سجاد حسین جن کی صاحبزادی سرورۃ النساء خواجہ غلام السبطین کی اہلیہ اور خواجہ عباس کی والدہ تھیں۔

لہ مالک رام: تلامذہ غالب ص ۸۷،

۳۔ عنایت فاطمہ

مولانا کے دونوں فرزند تعلیم یافتہ اور خوشحال اور بلند اقبال تھے۔ ان کے دونوں نواسے حافظ و شہرت و علمیت میں آفتاب و ماہتاب گذرے۔ اُن کی اولاد در اولاد آج بھی علم و ادب میں ممتاز مقام رکھتی ہے اور سب اپنے اپنے انداز پر ملک و قوم، علم و ادب کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مشاغلِ زندگانی

ملازمت — شاعری — تصنیف و تالیف

خدمتِ قوم و وطن

دس بارہ سال کی عمر میں بچے کو اپنے حالات پر غور کرنے کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ حالی کا گھر شریفانہ ماحول رکھتا تھا۔ حالی فطرتاً ہوشمند اور حسّاس آدمی تھے۔ اُنہوں نے والدہ کی معذوری دیکھی۔ والد کی ضعیفی اور بیماری میں نوکری کا سہارا ختم ہوتے دیکھا۔ وہ خود کہتے ہیں:

"زیادہ تر بھائی کی نوکری پر سارے گھر کا گزارا تھا ——!"

ایک آدمی کمانے والا اور پورا گھر کھانے والا۔ بھائی بھی چاہتے ہوں گے کہ حالی کچھ سہارا دیں، چھوٹا بھائی بھی مستقل حیثیت اختیار کرے۔ اس لئے اُن کی شادی کر دی۔ حالی ان مشکلات سے باخبر تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ذرا کچھ پڑھ لکھ لیں۔ تاکہ باعزت نوکری اور خوشحال زندگی کے لیے راہیں کُھل جائیں۔ شادی کے بعد وہ بڑی حد تک بھائی کو سبکدوش کر چکے تھے اس لئے چپکے سے پڑھنے کے لئے دہلی روانہ ہو گئے۔ لیکن بھائی کو سبکدوش کرتے ہی ان کے کاندھے بھی تو وزنی ہو گئے تھے۔ بیوی کا بوجھ، ہونے والے بچوں کی پرورش کا خیال اور کم و بیش بھائی بہنوں کے حقوق کا تقاضا، حالی ان سب باتوں سے باخبر تھے مگر پڑھنے کے شوق میں یہ فکر بھلا دی تھی۔ آخر گھر والوں نے بُلایا اور حالی کو پانی پت جانا پڑا۔ گھر پہنچے تو نوکری پر مجبور ہوئے اور پہلے پہل ضلع حصار کے کلکٹر کے دفتر میں ملازمت مل گئی ۱۸۵۶ء

میں ان کی عمر ہی کیا تھی۔ ۱۸۳۷ء کو اگر سال ولادت مانا جائے تو اُس وقت اُنیس برس کے قریب تھے۔ تعلیم بھی نامکمل تھی، اس لئے تنخواہ بھی پندرہ بیس سے زیادہ کیا ہوگی۔ اگرچہ اس زمانے میں پندرہ بیس کی تنخواہ عام تھی اور اس تنخواہ میں اچھی خاصی گذر بسر ہو جاتی تھی۔ لیکن یہ نوکری وطن میں نہ تھی۔ لہٰذا اخراجات بھی زیادہ تھے اور سکون بھی کم تھا۔ اتفاق کی بات کہ سال ڈیڑھ سال میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ انقلاب رونما ہو گیا۔ انگریزی نظام درہم برہم ہونے کی وجہ سے حالی کو وطن لوٹ آنا پڑا۔

بے کاری کے زمانے میں حالی پڑھتے لکھتے رہے۔ چار پانچ سال کے بعد انہیں خود بھی کسب معاش کے لئے کسی اچھے ذریعے کی تلاش ہوئی۔ اب حالی علم و عمر کی منزلوں میں کمال تک پہنچ گئے تھے۔

پانی پت اور دہلی میں فاصلہ ہی کیا تھا، دہلی میں علم و اعزاز بھی تھا اور باوقار ماحول بھی، حالی دہلی سے رابطہ بھی رکھتے تھے۔ غدر کے دنوں میں دہلی کے بہت سے شرفاء، علماء، ادبا اور شعراء پانی پت میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ حالی کے ان سے تعلقات بھی استوار ہو گئے۔ نوکری کی فکر میں گھر سے نکلے تو پائیں باغ دہلی پہنچ گئے۔ دہلی میں نہ معلوم کسی کے ذریعے یا خود براہِ راست نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کے یہاں رسائی ہو گئی اور حالی شیفتہ کے متوسلین یا ملازمین کی فہرست میں آ گئے۔ میرے خیال میں یہ واقعہ ۱۸۶۳ء سے متعلق ہے۔

مولانا نے خود نوشت سوانح میں جو کچھ لکھا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے:

(ا) ۱۸۵۷ء میں پانی پت آئے اور " قریب چار برس کے (پانی پت میں) بے کاری کی حالت میں گزرے "۔ یعنی ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰۔

(ب) " غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بیکاری کی حالت میں گزر گئے تو فکرِ معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا۔ حسنِ اتفاق سے ۱۸۶۳ء میں نواب مصطفٰے خاں --- سے شناسائی ہو گئی اور آٹھ برس تک بطور مصاحبت کے ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔"

نتیجہ: اگر پہلے بیان کو صحیح مانا جائے تو "قریب" کے لفظ کی رعایت سے سات مہینے ۱۸۵۷ء کے اور پورے تین سال مزید شمار کیجئے، یعنی سنہ ۱۸۶۱ء میں وہ پانی پت سے نکلے ـــــ اور اگر دوسرے بیان کو بلا تاویل درست مانیئے تو "کئی برس" کے معنی یہ ہوئے کہ پانی پت میں چھ سات سال قیام کیا اور ۱۸۶۳ء میں نواب شیفتہ کے یہاں ملازم ہوئے۔ مگر آٹھ سال کی مصاحبت غلط ہوئی جاتی ہے۔ کیونکہ شیفتہ نے ۱۸۶۹ء میں رحلت کی تو سنہ اور چھ ۶۹ ہوتے۔ لہٰذا مالک رام نے ٹھیک لکھا کہ یہ ملازمت چھ سال رہی۔

لیکن اگر یوں کہیئے کہ مولانا نے ۱۸۶۳ء غلط لکھا۔ آخری ٹکڑے یعنی آٹھ سال کو صحیح اور چار سال اوّل کو صحیح جانیے تو بات وہ ہوئی جو خلیل الرحمٰن داؤدی نے کہی :

> " مولانا حالی ۱۸۶۱ء کے اختتام پر پانی پت سے نکل کر شیفتہ کے پاس پہنچے اور آٹھ سال تک وہاں رہے"۔
>
> (مقدمہ یادگار غالب ص ۱۵)

میری رائے میں حالی نے اوّل سے آخر تک سنین کا ذکر تخمینی طور پر کیا ہے۔ اس کی ایک مثال دیوان کا ایک حاشیہ پیش کرتا ہے۔ مولانا نے اپنے شعر :

رہے لاہور میں آکر سو جانے ۔۔۔۔ یہی دنیا ہے جو دارالمحن ہے

پر نوٹ لکھا ہے :

> " یہ غزل تقریباً ۱۲۸۹ھ میں اس وقت لکھی جبکہ اوّل اوّل بتقریب ملازمت دلّی چھوڑ کر لاہور جانا پڑا تھا"۔

حالانکہ مولانا ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء میں نہیں بلکہ ۱۲۷۷ھ/ ۱۸۶۰ء میں لاہور آئے تھے۔

تاریخوں کے اسی تخمینی تذکرے سے باخبر ہو کر بعض حضرات نے واقعات بیان کرتے ہوئے اپنی تاریخوں کو پسند کیا ہے۔ مثلاً ایک صاحب نے عقد کا واقعہ مولانا کے بیان کردہ ۱۲۵۴ھ کے بجائے ۱۲۵۲ھ لکھا ہے۔ لہٰذا ہم سنین کی بجائے مدّت پر بھروسہ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مولانا ۱۸۶۱ء کے قریب پانی پت سے نکل کر دہلی آئے۔

اور یہاں کوشش میں لگے رہے۔ ۱۸۶۳ء میں شیفتہ کے یہاں مستقل طور پر ملازم یا مصاحب ہو گئے۔

شیفتہ کی ملازمت (یا بقول مولانا "مصاحبت") سے کیا آمدنی تھی؟ انہیں دہلی اور جہانگیر آباد میں کیا کام کرنا ہوتا تھا؟ خمخانۂ جاوید کے مؤلف لالہ سری رام کہتے ہیں کہ مولانا شیفتہ کے صاحبزادوں کے معلم تھے[1]۔ مالک رام معین طور پر نقش بند خاں مہجور کی تعلیم کا فریضہ بتاتے ہیں۔ گویا حالی کا اصل کام نقش بند خاں یا دوسرے صاحبزادگان شیفتہ کی اتالیقی تھا۔ نقش بند خان مہجور کے بارے میں حالی نے ایک قطعۂ تاریخ وفات بھی لکھا ہے۔ جس مصرعہ تاریخ ہے:

"وحلوا اساور من فضۃ"

حالی نے شیفتہ کے یہاں بڑی عزت و محبت سے زمانہ گذارا۔ شیفتہ علم دوست رئیس تھے، مذہبی خیالات کی ہم آہنگی اور ادبی ذوق کے اشتراک نے ایک دوسرے کو متاثر کر لیا۔ حالی کہتے ہیں کہ میں نے شیفتہ سے حقیقت پسندی سیکھی۔ غالب کے بعض خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شیفتہ کو حالی سے اس حد تک تعلق خاطر تھا کہ جب حالی موجود نہ ہوتے تو وہ اداس رہتے تھے۔ عودِ ہندی صفحہ ۳۳۳ (طبع مجلس ترقی ادب، لاہور) پر نواب مصطفیٰ خاں کو لکھتے ہیں:

> "یقین ہے کہ آپ مع الخیر اپنے دار الریاست میں پہنچ گئے ہوں گے
> اور بہ جمعیت خاطر روزہ رکھتے ہوں۔ سوائے پان کے کوئی خیال
> اور مولوی الطاف حسین کے فراق کے سوا کوئی وجہ ملال نہ ہو۔"
>
> (مکتوب فروری ۱۸۶۵ء)

نواب صاحب کے یہاں مشاعرے ہوتے اور طرحی غزلیں لکھی جاتی ہوں گی۔ علمی مباحثے ہوتے تھے، غالب کے بارے میں گفتگو رہتی تھی۔ حالی نے اس قسم کے مسائل میں دلچسپی لی اور بلاشبہ بہت کچھ سیکھا اور تجربہ حاصل کیا۔

---

[1] مہجور نے ۲۸ شوال ۱۲۹۴ھ / ۵ نومبر ۱۸۷۷ء میں رحلت کی۔ (تلامذہ غالب صفحہ ۱۸۵)

۱۸۶۹ء میں نواب صاحب کا انتقال ہوگیا اور حالی کو کسی نئی جگہ کی فکر ہوئی۔ لاہور کے محکمۂ تعلیم میں سرکاری بک ڈپو میں اسسٹنٹ ٹرانسلیٹر (معاون ترجمان) کی جگہ نکلی تو مولانا حالی نے بھی کوشش کی اور یہ جگہ حاصل کر لی ــــ مالک رام صاحب کہتے ہیں کہ حالی کی یہ ملازمت پیارے لال آشوب کی بدولت تھی[1]، ایک خیال یہ ہوتا ہے کہ کریم الدین پانی پتی نے کوشش کی ہو، یا مولانا آزاد نے دعوت دی ہو۔ بہرحال حالی کی یہ تیسری ملازمت تھی۔ اس محکمہ میں ان کا کام یہ تھا اُردو میں ترجمہ شدہ کتابوں کی زبان دیکھ لیا کریں۔

کچھ عرصے تک تو لاہور[2] سے ڈاک کے ذریعے کتابیں دہلی جاتی ہیں اور مولانا دیکھ کر واپس کرتے رہے۔ لیکن ۱۸۷۰ء میں اُنہیں لاہور آنا پڑا۔ لاہور میں اُن کی مصروفیات محکمے کی کتابوں اور ترجموں پر نظر رکھنے کے علاوہ اتالیق پنجاب کی نائب مدیری بھی تھی۔ انہیں مشاعروں میں شرکت اور ادبی مسائل پر سوچنا بھی ہوتا تھا۔ اخبارات کا مطالعہ، صحافت کا تجربہ، دہلی کے باہر زبان دانی اور زبان فہمی کے مسائل، اعلیٰ تعلیم میں اُردو کا مرتبہ دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر لائٹنر، میجر فلر اور محمد حسین آزاد کے رجحانات اور تالیفات و مباحثات سے براہ راست تعلق پیدا ہُوا۔

مگر آہستہ آہستہ اُن کی طبیعت اُچاٹ ہوتی گئی۔ تحقیقی اسباب تو خدا جانے مگر ایک سبب یہاں کے وہابی اور غیر وہابی حضرات کے جھگڑے تھے[3] دوسرے ہجوم امراض اور دیگر عوارض بھی تھے۔ اُنہیں لاہور آتے ہی محسوس ہُوا کہ یہاں نہ کسی سے جان ہے نہ پہچان[4] کبھی ہیضہ کا حملہ، کبھی چیچک کا زور، کبھی بخار کی وَبا ہے[5]۔ ایک غزل میں تو چیخ اُٹھے :

کروں تجھ سے بیاں کچھ دردِ غربت ‌ ‌ ‌ ‌ مگر جوشِ سخن مہرِ دہن ہے

---

[1] تلامذۂ غالب صفحہ ۸۶۔ [2] اسماعیل پانی پتی: مولانا حالی کا لاہور آنا، امروز لاہور ۲۳ مارچ ۱۹۵۰ء

[3] خلیل الرحمٰن بحوالہ ڈاکٹر وحید قریشی مقدمہ یادگارِ غالب ص ۲۱

[4] حاشیہ برکھا رُت۔ حالی۔

[5] دیوان حالی طبع اوّل حاشیہ ص ۱۲۹۔

رہے لاہور میں آکر سو جانے ! | یہی دنیا ہے جو دارالمحن ہے
نہیں آتی کہیں یاں بوئے یوسفؑ | مگر جو گھر ہے وہ بیت الحزن ہے
یہاں بیگانگی ہے اس قدر عام | کہ بلبل ناشناسائے چمن ہے

پھر دوسری غزل میں لکھا ہے :

شہر و دریا سے، باغ و صحرا سے | بو نہیں آتی آشنائی کی
نہ ملا کوئی غارتِ ایماں | رہ گئی شرم پارسائی کی
بخت ہمداستانیٔ شیدا | تو نے آخر کو نارسائی کی
صحبت گاہ گاہی رشکی ! | تو نے بھی ہم سے بے وفائی کی

زندہ پھرنے کی ہے ہوس حالیؔ
انتہا ہے یہ بے حیائی کی

منشی محمد کرم اللہ خان شیداؔ دہلوی اور آنریبل نواب علی محمد خاں رشکی فرزند شیفتہ کی یادیں ستاتی رہیں۔ آخر خود ہی درخواست دے کر اپنا تبادلہ اینگلو عربک اسکول دہلی کرالیا، جہاں السنہ شرقیہ کے ہیڈ مولوی کی جگہ مل گئی اور مولانا ۱۸۷۴ء کے آخر یا ۱۸۷۵ء کے آغاز میں دہلی پہنچ گئے۔[۱]

دہلی اینگلو عربک اسکول کے فرائض تدریس معلومہ اطلاعات کی روشنی میں جو یہ تھی ملازمت تھی۔ یہ ملازمت ۱۸۷۵ء سے ۱۸۹۲ء تک رہی۔ گویا سترہ سال تک تعلیم ہی سے وابستہ رہے۔

سترہ سال کی مدت میں پانچ مہینے سے کچھ زیادہ[۲] جنوری ۱۸۸۷ء سے جون ۱۸۸۷ء تک دوبارہ لاہور آئے اور چیفس کالج میں بحیثیت اتالیق کام کر کے دوبارہ اپنی جگہ پر دلی واپس چلے گئے۔

---

[۱] حاشیہ دیوان حالی طبع اول ص ۱۳۱

[۲] محمد اسماعیل : مولانا حالی کا لاہور آنا۔ امروز ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء

[۳] محمد اسماعیل : حوالہ مذکور

۱۸۹۲ء میں اُنھیں حیدر آباد سے سو روپے[۱] ماہانہ وظیفہ ملنے لگا۔ جس کے بعد مولانا نے ملازمت ترک کر کے خانہ نشینی اختیار کر لی اور علمی کام شروع کر دیا۔

لاہور کی ملازمت کو اگر محکمہ تعلیم کی ملازمت فرض کیا جائے تو شاید یہ کہنا درست ہو کہ وہ آخر تک ایک ہی محکمہ میں ملازم رہے۔ جس میں لاہور کا محکمہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، دہلی کا اینگلو عربک اسکول اور لاہور کا چیفس کالج ان کا حلقہ فرائض رہا۔

چیفس کالج کی انگریزی فضا، انگریزی ماحول، انگریزی زبان کے نئے نئے مظاہر دیکھے اور جدت کے مفہوم و عمل کو اچھی طرح سمجھ لیا۔

لاہور میں مجلسی سرگرمیوں میں حالی کا حصہ ابھی تک تفصیل سے بیان نہیں ہوا۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کس محلے اور کس مکان میں رہے۔ اہل و عیال ان دنوں کہاں تھے، وطن میں یا ہمراہ!

۱۸۷۵ء میں سر سید نے ایم۔ او۔ اے کالج قائم کیا۔ برصغیر کا اس ادارے کے ردِ عمل سے عجیب عالم تھا۔ حالی سر سید کے گُن گاتے اور ان کے کام کو سراہتے تھے۔ دہلی پہنچ کر یہ حمایت شدت اختیار کرتی گئی۔ وہاں کے جلسوں میں ان کی نظمیں بہت مقبول تھیں، مشاعروں میں جب بھی غزل پڑھتے تو شہر میں بہت دنوں تک اس کے چرچے رہتے تھے۔ ملک کے رسائل و اخبارات میں اُن کی مخالفت و موافقت میں مضامین چھپتے تھے۔ سر سید کے جلسوں میں اُن کی شرکت اور تقریریں نیز نظمیں بڑے ذوق و شوق سے سُنی جاتی تھیں۔ سر سید کے وفدوں میں حالی بھی رُکن کی حیثیت سے ہمراہ ہوتے تھے۔

شاعری | مولانا حالی کا گھر شعر و شاعری کے تذکروں کا گھر تھا، ان کے بھائی امداد حسین کا تخلص مظہر تھا اور بظاہر اچھے شاعر تھے ـــ جیسا کہ دیوان حالی کے آخر میں درج شدہ قطعات تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے ـــ اس لئے حالی نے بچپنے ہی میں شعر کہنا شروع کر دیئے ہوں تو کوئی تعجب نہیں۔ سر دست جو ماخذ سامنے موجود ہیں اُن کی روشنی میں صرف اتنا کہا جاسکتا

۱۔ بقول محمد یحییٰ تنہا حیدر آباد کے سو روپے حکومتِ ہند کے اسی روپوں کے برابر ہوتے تھے۔ سیر المصنفین ج ۲ ص ۳۶۰۔

ہے کہ سترہ اٹھارہ برس کے سن میں وہ ایک غزلیں کہہ چکے تھے۔ خود نوشت میں کہتے ہیں:

"جس زمانے میں میرا دلی جانا ہوا تھا مرزا اسد اللہ خاں غالب
مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور اکثر اُن کے
اُردو فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے اُن کے
معنی اُن سے پوچھا کرتا تھا۔ اور چند فارسی قصیدے اُنہوں نے
اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے۔
اُن کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر
کرنے سے منع کیا کرتے تھے۔ مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اُردو
یا فارسی کی لکھ کر اُن کو دکھائی تو اُنہوں نے مجھ سے کہا:
"اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا
لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر
نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے"!
مگر اُس زمانے میں ایک دو غزل (غزلوں) سے زیادہ دلی میں شعر
لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا"۔

یعنی ۱۸۵۵ء میں اُنہیں اتنی مشق ہو چکی تھی کہ اُردو تو اُردو، فارسی میں بھی شعر کہہ سکتے تھے اور غالب جیسے آدمی کو سُنا کر اصلاح کی درخواست کر سکتے تھے۔ اِس سے بڑھ کر یہ بات کہ مرزا غالب ان کے شعروں سے اندازہ لگاتے ہیں کہ یہ نوجوان شاعری کے معیار پر پُورا اُترے گا۔

تخلص | خواجہ صاحب کا مشہور تخلص حالی ہی ہے۔ ان کے تمام سوانح نگار یہی لکھتے ہیں۔ محمد اسماعیل پانی پتی نے "جواہراتِ حالی" میں سے ایک مخمس نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

"قاضی محمد عمر صاحب ساکن ضلع مظفر نگر نے ۔۔۔۔ ۱۲۷۲ھ
میں "حدیثِ فارسی" کے نام سے انہیں شائع کیا۔ اِس میں مولانا
کے نام سے مندرجہ ذیل نظم کتاب کے صفحہ ۲۳ پر لکھی ہے۔

لیکن آخر میں تخلص بجائے حالی کے خستہ ہے۔ اب نہ معلوم
اس وقت مولانا کا تخلص ہی عام طور پر "خستہ" تھا یا اس
خاص نظم میں مولانا نے اپنا یہ تخلص رکھا تھا۔" (جواہرات ص ۱۷)

مالک رام صاحب نے اس بیان پر بھروسہ کر کے لکھا ہے :

"اس زمانے میں وہ خستہ تخلص کرتے تھے۔ چنانچہ اُن کی جو
تضمین قدسی کی مشہور نعت پر "مجموعہ قدسی" میں شامل ہے اس
میں بھی یہی تخلص ہے۔" (تلامذۂ غالب ص ۸۶)

مگر ۱۸۵۴ء، ۱۸۵۵ء اور ۱۸۵۶ء میں چھپنے والی کتاب میں کسی کلام کے داخل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مؤلف نے اس شاعر کا کلام کچھ پہلے سے جمع کیا ہوگا۔ پھر طباعت میں بھی سال چھ مہینے لگے ہوں گے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ حالی نے بارہ تیرہ برس کی عمر میں اُستادانہ شہرت اور پختہ کلامی حاصل کرلی تھی۔ مجھے تو یہ مخمس دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ شاید الطاف حسین خستہ کوئی اور صاحب ہیں، حالی نہیں۔

اُستاد | خواجہ صاحب کے بڑے بھائی امداد حسین صاحب شاعر تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گھر میں شعر و شاعری ہوتی تھی (کیا بعید ہے کہ اُن کے والد بھی شاعر ہوں) پھر شادی کے بعد خواجہ صاحب دلی آئے اور یہاں کے شعراء سے ملے۔ مشاعروں میں گئے۔ سب سے بڑھ کر خود فرماتے ہیں :

"ایک مرتبہ مرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوا اور انہیں اپنا
کلام سُنایا تو اُنہوں نے فرمایا کہ اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح
نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہیں
کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔"

ظاہر ہے کہ سولہ سترہ برس کی عمر میں غالب کی اِس ہمت افزائی سے متاثر ہوئے ہوں گے اور جب شیفتہ کے یہاں پہنچے اور باقاعدہ شاعری کو فن بنایا، اس وقت کا ذکر ہے :

"اُردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ اُنہی کے ساتھ مَیں بھی اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا مگر درحقیقت مرزا کے مشورے اور اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان سے لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حُسنِ بیان سے دلفریب بنانا اسی کو منتہائے کمالِ شاعری سمجھتے تھے۔"

شیفتہ کی ولادت ۱۸۰۶ء میں ہوئی۔ جب حالؔی اُن کے یہاں پہنچے، اُس وقت وہ پچاس سے اُوپر تھے اور حالؔی کی عمر بیس بائیس سال تھی۔ امارت، عمر اور مصاحبت جیسے عوامل نے حالؔی کو ان کا شاگرد بننے پر مجبور کر دیا۔ ظاہر ہے کہ حالؔی نے شیفتہ سے بھی تلمذ حاصل کیا ہے۔ اور شاعری میں اُن کے دو اُستاد ہوئے — غالبؔ اور شیفتہ۔ اخبار "عصرِ جدید" میرٹھ کے شمارہ ۲، جنوری ۱۹۱۵ء میں ایک شعر چھپا تھا۔ جسے "جواہراتِ حالؔی" میں صفحہ ۱۲۱ پر "حالؔی کے اُستاد" کے عنوان سے لکھا گیا ہے:

حالؔی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے
غالبؔ کا معتقد ہے، مقلّد ہے میرؔ کا

عصرِ جدید کے مالک مُدیر جناب آنریبل خواجہ غلام الثقلین صاحب خویش مولانا حالی تھے۔ جواہراتِ حالی، محمد اسماعیل صاحب پانی پتی نے مرتب کی اور خواجہ غلام الحسنین صاحب نے اس پر دیباچہ لکھا، اس لئے تلمّذ کی یہ روایت بظاہر مستند ہے۔ لہٰذا بعض لوگوں کا دوسرے مصرعہ کو "شاگرد میرزا کا، مقلّد ہوں میرؔ کا" نقل کرنا اور کہنا کہ یہ شعر دیوان میں موجود نہیں، لہٰذا شیفتہ کی شاگردی مشتبہ ہے[1]، درحقیقت زبردستی ہے۔

عربی اشعار کے بارے میں میرا خیال ہے کہ شیفتہ کے علاوہ کسی اور سے اصلاح لی

---

[1] پنجاب یونیورسٹی کا اُردو مجلہ "محور" ص ۴۱، جولائی ۱۹۶۵ء

ہوگی۔ کیا بعید ہے کہ فیض الحسن صاحب سے رجوع کیا ہو۔

حالؔی کو شاعری سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ پھر دلی کے قیام نے اس شوق کو ہوا دی ہوگی۔ وہ دہلی کے عام مشاعروں کے غالبؔ کے نجی شعری اجتماعات میں شریک ہوئے اور قلعہ میں بھی اساتذہ کو جاکر سُنا۔ ۱۸۵۰ء میں دہلی کے بہت سے باکمال شاعر پانی پت پہنچے ہوں گے۔ ان میں میر مہدی مجروحؔ تو بہت دنوں تک محلہ انصار میں مقیم رہے۔ ممکن ہے یہ لوگ شعر و شاعری کی محفلیں جماتے ہوں اور حالؔی اس میں کبھی تماشائی اور کبھی شاعر کی حیثیت سے شرکت کرتے رہے ہوں۔

نواب مصطفیٰ خاں کے یہاں تو خیر امیرانہ دربار اور مصاحبوں کی شاعری کا چرچا ضرور رہتا ہی تھا۔ شیفتہ ان دنوں غالبؔ سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ غالبؔ کا کلام جہانگیر آباد آتا ہوگا۔ ان پر رائے زنی ہوتی ہوگی۔ غالبؔ کی طرحوں پر مشاعرے ہوتے ہوں گے۔ اور شیفتہ و حالؔی دونوں کہتے، اصلاح لیتے اور پڑھتے ہوں گے۔ دیوان میں قدیم کلام بہت کم ہے —— شاید تلف ہو گیا ہوگا۔ بہرحال جو کچھ ہے اس میں غالبیت کم شیفتگی زیادہ۔

شیفتہ جاگیردار رئیس تھے، اس لئے جو کہتے تھے لوگ آنکھوں سے لگاتے اور سر پہ رکھتے تھے۔ مقدس اور مذہبی آدمی تھے، اس لئے احترام و عقیدت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ بعض اخلاقی خوبیوں کی بنا پر چند بڑے بڑے آدمی اُن کی سخن فہمی کا لوہا مانتے تھے، جس میں غالبؔ کا شعر تو مشہور رہی ہے:

نوشت در دیوان غزل   تا مصطفےٰ خاں خوش نکرد

حالؔی کی جوانی، شیفتہ کی شہرت، وقار اور بزرگی سے دبی، حالؔی کے شعر میں کچھ تو ان کی خستہ حالی آئی، کچھ شیفتہ کی ثقاہت اور یہ دونوں باتیں ان کی غزل کے رگ و پے میں سرایت کر گئیں۔

<u>ادوار شاعری</u> حالؔی کے شعری سرمائے تین حصوں پر بانٹے جا سکتے ہیں۔ ۱۸۵۴ء سے ۱۸۶۹ء تک یعنی پانی پت، دہلی، جہانگیر آباد کا زمانہ۔ بظاہر یہ زمانہ غزل گوئی اور چند قصیدوں

کی نگارش میں صرف ہوا[1]۔ پانی پت میں اُن کی شاعری بہت ابتدائی منزلوں میں تھی۔ جب مجروح اور ان کے ساتھ ۱۸۵۷ء میں پانی پت پہنچے تو حالی نے ان کو دیکھا اور شاید اُن کے ساتھ شعر بھی کہے۔ دہلی اور جہانگیر آباد میں شیفتہ کے ساتھ مشق سخن کی، مشاہیر کے ساتھ مشاعروں میں شرکت کی[2] غالب کا مرثیہ اس عہد کا شاہکار ہے۔

دوسرا حصہ ۱۸۷۰ء سے ۱۸۷۵ء تک کا سرمایہ ہے۔ اُن کے جدید رجحانات کے ابھار، ان کے عمدہ خیالات اور اچھے تخلیقات کا زمانہ یہی ہے۔

۱۔ انگریزی کہانی کا منظوم ترجمہ ـــــ جوانمردی کا کام ۱۸۷۲ء
۲۔ برکھارت ـــــ ۱۸۷۴ء
۳۔ نشاطِ اُمید ـــــ ۱۸۷۴ء
۴۔ حبِ وطن ـــــ ۱۸۷۴ء

اور دو تین غزلیں، ایک دو قطعے، وغیرہ۔

۱۸۷۵ء سے ۱۹۱۳ء تک غزل، مسدس، قطعہ، رُباعی وغیرہ کا ذخیرہ ہے۔ اور یہی دَوران کے محفوظ کلام کا زمانہ ہے۔ انہی دنوں اُنہیں نمایاں شہرت و محبوبیت حاصل ہوئی۔ بچوں کے لئے لکھا، جوانوں کے لئے لکھا۔ اخلاق و سیاست و ادب، مزاح و تنقید و اصلاح کو نصب العین بنایا، قصیدے بھی لکھے اور مشاعروں سے نکل کر عام جلسوں میں گوہر افشانیاں کیں، سرسیّد اور دوسرے علمی اداروں کے لئے نظمیں لکھیں۔

مناجات بیوہ اور مسدس مدوجزر اسی دَور کے شاہکار ہیں۔ آخری زمانے میں کچھ غزلیں اور رباعیاں بھی لکھی ہیں۔ چند قصائد اور قطعات بھی۔

---

[1] دیوان طبع اول میں ۲۰، بائیس غزلوں پر ق لکھا ہے۔

[2] حالی نے ایک رباعی میں یہ دَور یاد کیا ہے: مومن

غالب ہے نہ شیفتہ نہ ~~نیر~~ باقی ۔۔۔ وحشت ہے نہ سالک ہے نہ انور باقی

حالی اب اسی کو بزمِ یاراں سمجھو! ۔۔۔ یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

تصنیف و تالیف | مولانا حالی شاعر و مصنف کی حیثیت سے ہمارے ادب کا جزوِ لاینفک ہیں مولانا کی زندگی قلمی خدمتوں کے لئے وقف تھی۔ وہ بچپنے ہی سے تصنیف و تالیف کے شوقین تھے۔ اس میدان میں کم و بیش اٹھارہ اُنیس یادگاریں ہیں۔ یہ کتابیں منطق، علم الارض، تاریخ و عقائد، تنقید و ادب، نظم و نثر اُردو، عربی، فارسی زبانوں پر مشتمل ہیں۔ ایک نظر میں کتابوں کے نام اور موضوع دیکھتے چلئے :

۱۔ منطق کے مسئلہ پر عربی رسالہ ——— (۱۸۵۴ء) تلف ہو گیا۔

۲۔ مبادی علم جیولوجی ——— طبع لاہور ۱۸۸۳ء[۱] تالیف قبل ۱۸۷۵ء۔ یہ کتاب فرانسیسی سے عربی، عربی سے اُردو میں منتقل کی گئی۔

۳۔ اصول فارسی ——— تالیف ۱۸۶۸ء قلمی صفحات ۲۵۹[۲]، نامکمل و غیر مطبوعہ، اس کی تمہید و عنوانات نقوش ۱۹۵۳ء میں چھپ چکے ہیں[۳]۔

مذہبیات :

۴۔ مولود شریف :

مولانا نے جہانگیر آباد کی ریاست سے تعلق کے زمانے میں یہ رسالہ لکھا۔ خیال ہے کہ اس کی تالیف ۶۴ — ۱۸۷۰ء کے درمیان ہوئی لیکن اشاعت ۱۹۳۲ء میں ہوئی۔ مولود شریف ۹۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

۵۔ تریاق مسموم ——— عماد الدین نے تحقیق الایمان اور ہدایت المسلمین نامی کتابیں لکھی تھیں۔ مولانا نے ۶۷ — ۱۸۶۸ء کے درمیان میں تریاق مسموم لکھی۔ ڈاکٹر عبدالقیوم[۴] کے نزدیک یہ کتاب ہدایت المسلمین کے جواب میں اور تمام تذکرہ نگاروں کے نزدیک تحقیق الایمان کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ مولانا نے مقدمہ میں تحقیق الایمان ہی کا

---

[۱] صحیفہ، لاہور صفحہ ۹۴۔ حامد حسن صاحب قادری نے اس کا نام طبقات الارض لکھا ہے اور سن طباعت ۱۸۶۹ء جو قطعاً غلط ہے۔ [۲] صحیفہ، لاہور، صفحہ ۵۷، حالی کی اردو نثر نگاری صفحہ ۷۴

[۳] نقوش، اکتوبر، نومبر ۱۹۵۳ء۔

[۴] حالی کی اُردو نثر نگاری ص ۹۳ بعد — عبدالقیوم صاحب ایک مرتبہ تو یہ کہتے ہیں (یادگاری ص ۳۴)

نام لیا ہے۔ تریاق مسموم، رسالہ خیر المواعظ دہلی میں شائع ہوا۔

۶۔ "پادری عماد الدین کی تاریخ محمدی پر رائے منصفانہ" طبع ۱۸۷۱ء[1]

۷۔ شواہد الالہام: بقول محمد اسماعیل پانی پتی ۲۲ صفحات کا یہ رسالہ[2] ۱۸۷۵ء/۱۲۹۲ھ میں لکھا گیا اور طبع نہیں ہوا۔ تینوں کتابوں کی زبان گنجلک، مولویانہ اور بعض کی تحریر مقفیٰ بھی ہے۔ یہ کتابیں دقیق مسائل سے متعلق تھیں۔ اس لئے ان کی اشاعت محدود رہی۔

اخلاقیات:۔

۸۔ مجالس النساء: زنانہ مدارس کی مڈل جماعتوں کے لئے، یہ اخلاقی و اصلاحی کتاب ہے۔ ۱۸۷۴ء لاہور میں یہ کتاب لکھی گئی اور اسی زمانے میں لاہور سے شائع ہوئی۔ حکومت نے چار سو روپے کا انعام دیا۔

مجالس النساء کا انداز بیان آسان ہے مگر قصے میں کہانی کا تیور نہیں، مولانا نذیر احمد کی مرآۃ العروس کے سامنے اس کو فروغ حاصل نہ ہوا، یوں محکمہ تعلیم لاہور

(بقیہ حاشیہ ص ۳۱) کہ تحقیق الایمان ۱۸۶۹ء کے بعد لکھی گئی۔ دوسری مرتبہ یہ بھی مانتے ہیں کہ خود حالی نے دیباچہ میں تحقیق الایمان کی تردید کا ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مولانا تحقیق الایمان سے باخبر تھے گویا مولانا نے یہ کتاب پہلے سے دیکھی ہے یا یہ کتاب ۱۸۶۹ء سے پہلے ہی لکھی اور چھپی ہے۔ عبدالقیوم صاحب کو اشتباہ ہوا ہے۔ حاشیہ کی رائے مضبوط دلیل پر مبنی نہیں ہے۔

[1] حامد حسن قادری "منصفانہ رائے" ۱۸۷۲ء بتلاتے ہیں۔ نقوش شخصیات نمبر ص ۲۸ پر خواجہ غلام الحسنین صاحب نے اور صحیفہ ص ۳، نمبر ۱ میں کتاب کا عنوان و سن وہی ہے جو ہم نے لکھا ہے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم نے بھی حاشیہ میں ۱۸۷۱ء ماخذ ہے مگر متن میں ۱۸۷۲ء لکھا ہے۔ مولوی چراغ علی نے بھی اس کتاب پر تنقید لکھی تھی جو تالیفات کے نام سے ۱۸۷۲ء میں شائع ہوئی۔ (حامد حسن: داستان تاریخ اردو صفحہ ۳۷۵)

[2] ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب سن تالیف ۱۸۷۲ء لکھتے ہیں۔ حالی کی نثر نگاری ص ۱۸

سے بار بار شائع بھی ہوئی اور نصاب[1] میں بھی رائج رہی۔

سوانح حیات :

۸- سوانح حکیم ناصر خسرو۔ ۱۸۸۱ء میں مولانا نے سفرنامہ ناصر خسرو تصحیحات و فرہنگ کے ساتھ شائع کرنا چاہا تو اس پر ۳۲ صفحات کا مقدمہ لکھا۔ فارسی کا یہ مقالہ ناصر خسرو کے سوانح پر غالباً ہندوستان پاکستان میں پہلا کام جو ۱۸۸۲ء میں شائع ہوا۔

۹- حیات سعدی :

۱۸۸۶ء[2] میں مولانا نے سعدی کی زندگی اور ان کے تحقیقات پر تعارفی اور قادرے تنقیدی کتاب لکھ کر برصغیر تو خیر خود ایران کے لئے ایک نیا میدان پیدا کیا۔ انہوں نے مقدمہ میں لکھا کہ اگر مجھے موقعہ ملا تو دوسرے مشاہیر پر بھی کچھ لکھوں گا۔

۱۰- تذکرۂ رحمانیہ :

یہ سوانح عمری مولانا عبدالرحمٰن کی وفات ۱۸۹۶ء / ۱۳۹۶ھ میں "چودھویں صدی" راولپنڈی میں چھپی۔ دوبارہ نقوش پنج سالہ نمبر ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی۔

۱۱- یادگار غالب : طبع اول ۱۸۹۷ء کانپور۔

۱۲- حیات جاوید : سرسید کی سوانح حیات طبع اوّل ۱۹۰۱ء

مضامین و انشاء :

۱۳- مضامین : ــــــ تہذیب الاخلاق، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ، کالج میگزین، معارف علی گڑھ وغیرہ میں شائع شدہ مضامین کا مجموعہ جسے پہلے پہل وحیدالدین سلیم نے مرتب کر کے ۱۹۰۲ء میں شائع کیا۔

۱۴ **مقالات:** ــــــ انجمن ترقی اُردو نے خواجہ سجاد حسین کے جمع کردہ مضامین دو جلدوں

---

[1] مجالس النساء کے دونوں حصے پبلشرز یونائیٹڈ کے چھپے ہوئے میرے پاس موجود ہیں اس سے پہلے مطبع محمدی لاہور سے پہلا حصہ ۱۸۷۴ء میں پھر حالی پریس پانی پت میں چھپ کر شائع ہوا۔

[2] اکثر حضرات نے کتاب کا سنہ تالیف ۱۸۸۲ء لکھا ہے اور حیات سعدی طبع لاہور کے مقدمے میں بظاہر خود مولانا ۱۸۸۵ء لکھتے ہیں۔

میں مقالات حالی کے نام سے شائع کئے۔

۱۵۔ مکتوبات :۔ سجاد حسین صاحب ہی نے مکتوبات کا ایک مجموعہ مرتب کیا۔ جس پر عبدالحق نے مقدمہ لکھا۔ یہ مجموعہ ۱۹۲۵ء میں پانی پت سے شائع ہوا، اس کے بعد کچھ اور خطوط محمد اسماعیل پانی پتی نے جمع کئے اور مکاتیب حالی کے نام سے چھپائے۔

تنقید :۔ یوں تو حیات سعدی اور یادگار غالب دونوں عملی تنقید کی کتابیں کہی جاسکتی ہیں اور حالی نے اسے غالب و سعدی کی شاعری پر ریویو کا نام بھی دیا۔ لیکن براہ راست اصولی تنقید کا پہلا نمونہ

۱۶۔ "مقدمہ شعر و شاعری" ہی مانا جاتا ہے۔ یہ کتاب دراصل دیوان طبع اوّل کا مقدمہ تھا۔ اس کی افادیت کے پیش نظر مستقل کتاب کا درجہ دے دیا گیا۔ اور مدتوں اُردو تنقید میں اُسے بنیادی حیثیت حاصل رہی۔

شعری مجموعے : حالی کی غزلیات و منظومات شروع شروع میں اس عہد کے مشہور رسالوں اور اخباروں میں چھپنے کے ساتھ ساتھ الگ الگ بھی چھپے۔ مثلاً مسدس، تبنج گنج یا مرثیہ ملکہ وکٹوریہ، مناجات بیوہ وغیرہ۔ یہ اشاعتیں محدود نہ تھیں۔ میرے پاس لاہور کے چھپے ہوئے سات آٹھ منظومے ہیں۔ ممکن ہے دہلی وغیرہ میں بھی اسی طرح شائع ہوئے ہوں۔ ان متفرقات کو چھوڑ کر مولانا نے ایک مجموعہ

۱۷۔ دیوان ـــــــ کے نام سے مرتب کیا۔ اس دیوان سے پہلے ایک مقدمہ اور ایک دیباچہ لکھا۔ مقدمہ تو شعر و شاعری کی "ماہیت اور اُس کے حسن و قبح پر مفصل" بحث کے لئے لکھا اور دیباچے میں زمانے کے رجحانات اور مستقبل کے فنی تقاضوں پر سرسری گفتگو کے لئے۔ اس کے بعد قطعات، غزلیات، رُباعیات، قصیدے اور ترکیب بند و اشعار متفرقہ ہیں۔ آخر میں اپنے بھائی امداد حسین صاحب کے

چند قطعات تاریخ شریک کر لئے۔

یہ دیوان انصاری پریس دہلی سے ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا۔ دیوان کی طباعت وکتابت بہت عمدہ ہے، سرورق محمد رحمت اللہ رعد کے نامی پریس میں چھپا تھا، پشت پر اشتہار ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اس وقت علی گڑھ میں مقیم تھے۔ اور دیوان کی قیمت بترتیب ذیل تھی:۔

۱۔ کاغذ ولایتی، لوح مینا کاری پر کاغذ چرمی صہ [۱]

۲۔ کاغذ ولایتی، لوح سادہ پر کاغذ آبی سے

۳۔ کاغذ سی رام پوری، لوح سادہ پر کاغذ آبی عہ

.. .. راقم: سید عبدالعلی حویلی میر افضل حسین متصل کوچہ پنڈت ــــــــ

۱۸۔ مجموعہ نظم حالی: چند متفرقات کا مجموعہ جسے ایک دیباچے کے ساتھ مرتب کیا اور ــــــــ سنہ میں چھپوایا۔

۱۹۔ ضمیمہ اُردو کلیات حالی: نظم و نثر فارسی و عربی کا مجموعہ جو تحفۂ ہند پریس دہلی سے اگست ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا۔

کلیات کے لئے مولانا نے اہتمام کیا تھا، مسودے اور متعلقہ مواد جمع کیا۔ ارادہ تھا کہ پانی پت سے باہر جا کر گوشۂ عافیت میں بیٹھیں اور جو کچھ متفرق ہے اُسے جمع کریں۔ آخر ضعیفی اور مصروفیات کا خیال کئے بغیر فرید آباد جا کر ڈاکٹر لیاقت حسین کے یہاں اُترے۔ ۱۹۱۲ء کے دو تین مہینے وہاں گزار کر پھر وطن واپس آ گئے۔ فرید آباد میں مداحوں اور ان کے معاملات نے رہنا دشوار کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے ترتیب کلیات کا کام رہ گیا۔ مولانا کے بعد لوگوں

---

[۱] میرے پاس دیوان حالی کا پہلا ایڈیشن قسم اوّل جناب ضیاء الحسن موسوی کا عطیہ موجود ہے۔ فاضل

نے کوشش کی اور متعدد مجموعے چھاپے۔ غزلیں الگ، مثنویاں الگ، رُباعیاں الگ۔ پھر ایسے مجموعے بھی شائع ہوتے جو اصل دیوان و ضمیمہ سے باقی ماندہ کلام پر مشتمل تھا۔

بعض چیزوں کے انگریزی، ہندی، پنجابی وغیرہ میں ترجمے بھی ہوئے۔ اچھے سے اچھے ایڈیشن بھی چھپے۔

۲۰- انتخاب کلامِ داغ : لالہ سری رام نے ۱۹۱۱ء سے پہلے خمخانہ جاوید میں لکھا۔ کہ مولانا کلامِ داغ کا انتخاب مرتب کر رہے ہیں۔ اب معلوم نہیں کہ یہ کام مکمل ہوا یا نہیں اور مکمل ہوا تو کہاں ہے۔

مولانا کے بعد ان کے کلام و مواد کو جناب سجاد حسین فرزند مولانا غلام الحسنین صاحب اور محمد اسمٰعیل پانی پتی نے محنت کے ساتھ مرتب کیا اور اس کی کما حقہٗ اشاعت بھی کی۔

قومی کام

ترقی تعلیم | مولانا نئی روشنی کے آدمی تھے، سیاسی سُوجھ بُوجھ تھی اور قوم کا درد بھی۔ وہ خود جدید علوم تو حاصل نہ کر سکے، اس لئے ردِّ عمل کے طور پر نئی نسل کو نئے علوم سے بے خبر نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ اُنہوں نے اپنے داماد، دیندار اور تعلیم یافتہ اور جدید علوم میں ماہر تلاش کئے۔ ان کی اُولاد میں آج تک علم کے نگہبان اور فلسفہ تعلیم کے ماہر و مبلّغ ہیں۔ دہلی میں اُن کا گھر عزیز بچوں اور پانی پت کے طالب علموں کی آماجگاہ تھا۔ وہ شہر کے دوستوں کو انگریزی تعلیم پر آمادہ کرتے تھے۔ اُن کے بچّوں کو دہلی لاتے اور اپنی نگرانی میں تعلیم دلاتے تھے۔

خواجہ غلام الحسنین صاحب نے مولانا کی سیرت پر مضمون لکھتے ہوئے یہ واقعہ بیان کیا ہے :-

"مولانا حالی نے میری والدہ مرحومہ (جو اُن کی حقیقی بھانجی تھیں) سے میرے متعلق فرمایا کہ اس کو دہلی بھیج دو۔ تاکہ میرے پاس رہ کر انگریزی تعلیم حاصل کر سکے۔ اُنہوں نے بخوشی منظور کیا مگر والد مرحوم نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مَیں اس کو دینی تعلیم دلانا چاہتا ہوں، انگریزی تعلیم دلا کر نیچری اور بے دین بنانا نہیں چاہتا۔ مولانا کو اس کی اطلاع ملی تو اُنہوں نے فرمایا :

"بھائی غلام عباس (میرے والد کا نام ہے)
ہرگز ایسا خیال نہ کریں میں تو اس لڑکے
کو دیندار اور پکا مسلمان بناؤں گا "

الغرض میری والدہ کے اور مولانا کے اصرار پر میرے والد بمشکل اس بات پر آمادہ ہوئے مگر جب اُنہوں نے دیکھا کہ دہلی کے

قیام اور انگریزی تعلیم نے مجھ پر کوئی مخالف اثر نہیں کیا۔ اور میرے مذہبی خیالات میں کوئی فرق نہیں پڑا بلکہ دینی ذوق روز بروز بڑھتا گیا تو بہت خوش ہوئے اور کچھ عرصے کے بعد میرے چھوٹے بھائی خواجہ غلام الثقلین مرحوم کو بھی دہلی بھیج دیا۔ اس کے بعد پانی پت کے بہت سے لوگوں نے اپنے بچّوں کو یکے بعد دیگرے دہلی بھیجنا شروع کیا تاکہ وہ مولانا کی نگرانی میں رہ کر انگریزی تعلیم حاصل کر سکیں۔

اب مولانا کو مکان تبدیل کرنا پڑا۔ پہلے جامع مسجد کے قریب حویلی مفتی صدر الدین خاں کے ایک حصّے میں رہتے تھے۔ اب کوچہ پنڈت کے قریب میر افضل کی گلی میں مکان لے لیا[۱] اور اپنے مکان کے متصل دوسرا مکان ہم کو کرائے پر دلا دیا۔

الغرض مولانا کی نگرانی میں ایک پرائیویٹ بورڈنگ ہاؤس قائم ہو گیا اور پانی پت کے لڑکے وہاں رہ کر تعلیم سے مستفید ہوئے[۲]"

علی گڑھ یونیورسٹی کی تحریک میں حالؔی نے بڑی گرم جوشی سے کام کیا۔ آخری عمر میں وہ پانی پت میں اسکول اور لائبریری کے لئے فکرمند ہوئے۔ حالی ہائی اسکول اور لائبریری اُن کے خوابوں کی تعبیر ہے۔

سرسیّد کی انجمن کے جلسے ہوتے یا علی گڑھ مدرسۃ العلوم کے لئے چندہ کی مہم اس میں حالؔی بھی بقدرِ امکان ساتھ دیتے، جلسوں کے لئے نظمیں لکھتے اور تقریریں بھی کرتے۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔ اس کے جلسوں میں بڑی خوشی خوشی شرکت کرتے تھے۔ اس کے بعض اجلاس اُن کی صدارت میں بھی ہوئے، انجمن حمایت اسلام

---

[۱] ۱۸۹۳ء تک حویلی میر افضل ہی میں رہے۔ اشتہار دیوان طبع اوّل۔
[۲] نقوش شخصیات نمبر ص ۴۲۔

لاہور میں بھی شرکت صرف جذبۂ اشاعت علوم کی بنا پر تھی اور اسی بنا پر علی گڑھ سے محبّت تھی۔

اصلاحِ معاشرہ

انیسویں صدی کے وسط میں برصغیر میں مسلمانوں کے زوال پذیر معاشرے کے اسباب کچھ بھی ہوں، دل آزار اور غم انگیز ضرور تھے۔ حاکموں کی محکومی، سرمایہ داروں کا نانِ شبینہ کو ترسنا، خاندانی رسم و رواج کی پابندیاں، مذہبی تہذیب میں غیر اسلامی علامات کا شمول، تعلیم سے غفلت بلکہ جہالت پسندی، جدید تقاضوں سے پُرانی قدروں کا تصادم، غرض پیچ در پیچ مسائل تھے۔ قوم کے سربراہ جہالت کے خلاف قوم کو للکارنے اُٹھے تو بہت سے نئے مسائل سامنے آئے۔ ان میں تجدیدِ مذہب اور اصلاحِ عقائد کی مہم بھی تھی۔ سرسیّد نے ہمہ گیر تحریک شروع کی تو مذہب پر قلم اُٹھانے سے نہ ڈرے۔ حالؔی کے اصلاحی رجحانات ماحول کے پروردہ تھے، سرسیّد کی ہمخیالی نے اُنہیں جدّت پسند بنایا۔ تعلیم، تہذیب اور رسم و رواج کے بارے میں وہ واضح طور پر عقلیت پسند تھے لیکن مذہب سے تصادم بُرا سمجھتے تھے۔ رسم و رواج پر تنقید کرتے تھے مگر مذہب کے معاملات میں عقائد کے بجائے عقیدت مند عوام کو نہ چھیڑتے تھے۔ وہ خود آخر تک پابند روزہ و نماز رہے۔ عوام نے اُن کو کبھی کافر نہیں کہا۔[1] شدّت ان کے مزاج سے دُور تھی۔ اس لئے مولوی چراغ علی اور محسن الملک کی طرح اُن کے افکار کا اظہار ہیجان آفریں نہ تھا۔ یعنی نہ تو اُنہوں نے قرآن و حدیث کا احتساب کیا، نہ مُلّا اور مُفتی سے اُلجھے۔ کبھی کبھی سرسیّد کی حمایت میں ذرا تیز ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ تیزی نہ حملہ کی صورت میں رُونما ہوئی، نہ ذاتیات پر تنقید کے انداز میں۔ حالؔی جذباتی ضرور ہوتے مگر بیان و اخلاق کے وضعداری نہ اصول نہ چھوڑے۔ براہ راست خطاب اور انتقام کا طریقہ اختیار نہیں کیا۔

---

[1] بعض اِنتہا پسندوں نے طعنے دیئے مگر عموماً اُن کے اعمالِ دینی پر گرفت نہیں کی گئی۔

بڑھے جس سے نفرت وہ تحریر کرنی
جگر جس سے شق ہو وہ تقریر کرنی
گنہگار بندوں کی تحقیر کرنی
مسلمان بھائی کی تکفیر کرنی
یہ ہے عالموں کا ہمارے طریقہ
یہ ہے ہادیوں کا ہمارے طریقہ

کوئی مسئلہ پوچھنے ان سے جائے
تو گردن پہ بارِ گراں لے کے آئے
اگر بد نصیبی سے شک اس میں لائے
تو قطعی خطاب اہلِ دوزخ کا پائے
اگر اعتراض اُس کی نکلا زباں سے
تو آنا سلامت ہے دُشوار واں سے

کبھی وہ گلے کی رگیں ہیں پُھلاتے
کبھی جھاگ پر جھاگ ہیں منہ پہ لاتے
کبھی خوک زوہ سگ ہیں اُسکو بناتے
کبھی مارنے کو عصا ہیں اُٹھاتے
ستوں، چشم بددُور، ہیں آپ دیں کے
نمونہ ہیں خلقِ رسولِ امیں کے

صوفیوں کے بارے میں لکھا ہے :۔

بہت لوگ پیروں کی اولاد بن کر
نہیں ذاتِ والا میں کچھ جن کے جوہر
بڑا فخر ہے جن کو لے دے کے اِس پر
کہ تھے اُن کے اسلاف مقبولِ داور
کرشمے ہیں جا جا کے جھوٹے دکھاتے
مریدوں کو ہیں لوٹتے اور کھاتے

یہ ہیں جادہ پیمائے راہِ طریقت
مقام ان کا ہے ماورائے شریعت
انہی پر ہے ختم آج کشف و کرامت
انہی کے ہے قبضے میں بندوں کی قسمت
یہی ہیں مراد اور یہی ہیں مرید اب
یہی ہیں جنید اور یہی بایزید اب

کلیاتِ حالی میں اس سے زیادہ کھُلی کھُلی باتیں ملنا مشکل ہیں۔ دو چار نمونے دس بیس شعروں کے وجود سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مولانا اس موضوع پر کھل کھیلے۔ دبے دبے جملے، چھُپے چھُپے نشتروں سے کام لیتے ہیں:

اہلِ حل و عقد ہیں اب متفق اس رائے پر
سیّد احمد خان کو کافر بنانا اسلام ہے

عموماً حالی کا یہی لہجہ ہے۔ ملا سے خطاب میں وکالتِ غیر یا بیانِ حال ان کا شیوہ ہے۔ مباحثہ اور تنقید میں حقائق سے دست و گریبان نہیں ہوتے۔ ان کے بیان کا مقصد اصلاح ہے تجدد نہیں۔ دوسروں کا تجدد پسند ہونا گوارا ہے مگر خود مصلح ہیں مجدد نہیں۔ نہ تعلیم میں سر سید اور شبلی نہ تصنیف میں چراغ علی اور محسن الملک ۔

مقدمہ شعر و شاعری، مجالس النساء اور بعض مضامین سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ حالی اخلاق کی برتری، علم کی بلندی اور عقائد و رسوم میں غیر متعصبانہ و معتدل رجحان کے علم و سائنس میں عقلیت پسندی، زمانے کے ساتھ لڑنے اور پڑھنے کا نظریہ پھیلانا چاہتے ہیں شروع شروع میں انہوں نے یہ پیغام شعر کی زبان سے نشر کیا اور اپنے دیوان کے سرورق پر پہلا فقرہ یہ لکھا:

"دُرمع الدھر کیف دار" ــــ جس رُخ زمانہ پھرے اُسی رُخ پھر جاؤ ــــ

نئی نسل کو انہوں نے نئے متداول علوم کی طرف لگایا، دہلی میں ہندو مسلمان خاندان اور غیر خاندان کے لڑکوں کو بلایا اور اپنی نگرانی میں پڑھایا، کوئی وکیل ہوا، کوئی ڈاکٹر، کوئی پروفیسر ہوا، کوئی انجینئر۔ حالی ان لوگوں کو دیکھ کر خوش ہوتے۔ ان کی ترقیوں کی دعائیں کرتے تھے۔ حکومت نے اسی جذبہ کی قدر اور ادبی عظمت کی بنا پر سن ۱۹۰۴ء میں "شمس العلماء" کا خطاب دیا۔ سن ۱۹۰۵ء میں مولانا نے پانی پت میں "وکٹوریہ پبلک لائبریری" قائم کی۔ کچھ عرصے کے بعد پانی پت والوں نے ان کی تمناؤں کے مطابق حالی ہائی اسکول اور دارُ المطالعہ کے ذریعے ان کی یادگار کی بنیاد رکھی۔ ملک نے اُن کے کلام کو اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ پر چھاپا۔ دوسری زبانوں میں ترجمے کئے، تنقید و سوانح پر کتابیں چھاپیں اور آج تک اُن کا قومی اور ادبی احترام ملحوظ رکھا۔

وفات

خواجہ عبدالمجید دہلوی لکھتے ہیں:۔

"میری بیوی کا ان سے پردہ نہ تھا۔ میری شادی کے بعد کبھی ایسا نہیں ہوا کہ حالی تشریف لاتے ہوں اور آتے جاتے گھر میں اس کے پاس ہو کر نہ گئے ہوں۔ آخری مرتبہ جب دہلی تشریف لائے اور رخصت ہونے کو گھر میں آئے تو میں بھی موجود تھا۔ صحت میں کوئی خاص خرابی نہ تھی البتہ

ضعف پیری ضرور تھا۔ جاتے وقت فرمانے لگے۔ بیٹی! خدا
حافظ۔ اب ملنا نہیں ہوگا۔ وہ رونے لگی۔ یہ بھی آبدیدہ ہو گئے۔
واقعی اس کے بعد وہ اُن سے نہ مل سکی۔ وہ دہلی آئے مگر مفلوج
ایک کوٹھی میں اُترے۔ میں بار بار گیا۔ مگر پردہ کی وجہ سے وہ نہ
جا سکی۔ اس زمانے میں گویائی بالکل مفقود ہو چکی تھی۔ مگر بمشکل
سے ایک دو لفظ بول سکتے تھے۔

پہلی مرتبہ جب سول سرجن معائنہ کو آیا، میں حاضر تھا۔ وہ کرسی
پر بیٹھے ہوئے تھے اور میز سامنے رکھی تھی۔ میز پر سے قلم اُٹھا
کر سول سرجن نے اُن کے سامنے کی اور پوچھا: یہ کیا ہے؟
یہ امتحان کے طور پر تھا۔ حالی صاحب کی عادت تھی جب اُن
سے سوال کیا جاتا تو سلسلہ کلام خیر کے لفظ سے شروع کرتے اور
یہ ایک خاص لہجہ میں ہوتا تھا۔ پھر ایک تبسم کی کیفیت چہرے
پر نمایاں ہوتی جس کا لطف دیکھنے ہی پر منحصر ہے۔ چنانچہ اُس
وقت بھی خیر کا لفظ عادت کے مطابق آہستہ سے کہا۔ اور
مسکرائے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سول سرجن کے سوال پر
ہنستے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں ایسا بے ہوش نہیں ہوں۔
پھر قلم کا لفظ منہ سے نکلا۔

اس کے بعد حالی پانی پت چلے گئے اور میرے سپرد
یہ خدمت ہوئی کہ وہاں سے جو کیفیت مریض کی لکھی ہوئی آئے
سول سرجن سے کہہ دیا کروں۔ جو جواب ملے، لکھ بھیجا کروں؛
یہ کام چند ماہ ٹھیک جاری رہا۔ پھر اُن کا انتقال ہو گیا۔"

(کیا خوب آدمی تھا ص ۲۰)

حالی کی عمر ستتر سال کے لگ بھگ ہو رہی تھی۔ بڑھاپا اور بیماریاں دن بدن بڑھتی

جاتی تھیں۔ آخر ۱۹۱۳ء سے صاحبِ[1] فراش ہو گئے۔ کھانسی اور بخار کی شکایت بہت زیادہ رہنے لگی تھی۔ فالج کا حملہ[2] ہوا جس سے بولنے کی طاقت نہ رہی۔ ۲۸ دسمبر سے حالت بہت نازک ہو گئی۔ آخر قرآن مجید اور[3] دعائیں سنتے سنتے ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء ۱۳ صفر ۱۳۳۳ھ کو دو بجے رات رحلت کی اور دوسرے دن شاہ بو علی قلندر کے صحن میں حوض کے کنارے دفن[4] ہوئے۔

ملک کے تمام اخبارات و رسائل نے اُن کی شخصیت پر مضامین و قطعات تاریخ لکھے۔ جن میں محمد ہادی عزیز کا قطعہ تاریخ یہ تھا:۔

شبلی و حالی آں سپہر علوم — آہ رفتند و شد جہاں خالی
سالِ ایں واقعات گفت عزیز — غمِ شبلی[5] بماتمِ حالی
۱۹۱۴

اور سیرت و شخصیت پر مختصر و جامع تبصرہ خواجہ غلام[6] الثقلین صاحب نے "عصر جدید" میں شائع کیا:

"مولانا، یونانی خیالات کی رُو سے ایک معتدل اور متوسط کامل انسان اور صوفیہ خیالات کی رُو سے ایک صاحب باطن ولی تھے۔ کبھی کسی کی بُرائی اُن کی زبان سے نہیں سُنی گئی، ہر شخص کے عیب کی نرم تاویل کرنا پسند فرماتے تھے، عزیزوں سے محبت رکھتے تھے۔ غریبوں کی امداد کے لئے ہمیشہ تیار رہتے۔

---

[1] اسمٰعیل میرٹھی نے لکھا ہے:

حضرت حالی کی رحلت تھی تو امرِ ناگزیر — سال بھر سے تھی دلوں میں یہ کھٹک سوہانِ روح

[2] مقدمہ یادگار غالب طبع مجلس ترقی ادب (ص ۴۶) کاتب نے ۳۱ دسمبر کو ۲۱ دسمبر لکھ دیا۔

[3] سیر المصنفین ج ۲ ص ۳۵۸۔ غلطی سے ۱۳۱۴ء کو ۱۳۲۴ء لکھا گیا ہے۔

[4] تلامذہ غالب ص ۸۷ [5] شبلی نے نومبر ۱۹۱۴ء میں رحلت کی تھی۔

[6] مولانا حالی کے حقیقی بھانجے اور داماد۔ نقوش، شخصیات نمبر ص ۳۵۔

کسی مذہب کے قائل سے سچ اور عمدہ بات سنتے تھے تو اس کی قدر کرتے اور تعریف کرتے تھے۔ مذہباً نہایت بے تعصب تھے۔ ان کے والدین شیعہ تھے اور مرحوم کو یتیم چھوڑ کر والدِ ماجد انتقال کر گئے تھے۔ بچپن میں اہل سنت و جماعت میں تعلیم پائی، لیکن اگر وہ شیعوں کی طرح تعلیم پاتے تب بھی ایسے ہی اعلیٰ خیال اور بے تعصب اور خیر خواہِ اسلام شیعہ رہتے۔ جیسے آپ بلند خیال، بے نفس، محب اہل بیت اور صوفی منش سُنّی تھے۔ مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کو نہایت مکروہ سمجھتے تھے اور طریقِ نماز کے اور کسی طرح اختلاف کے اظہار کو پسند نہ کرتے تھے۔ اُن کی اولاد اور خاندان میں دونوں طریقہ کے لوگ موجود ہیں اور وہ کسی کو یہ نہ کہتے تھے کہ وہ کیا طریقہ اختیار کرے۔ اُن کے پاس بیٹھنے اور باتیں سننے سے نہایت بد باطن شخص بھی روحانی فیض پاتے تھے۔ عدل اور میانہ روی مولانا کی خاص صفت تھی۔

پانی پت بلکہ اس تمام علاقے کو فخر ہو سکتا ہے کہ ایسا کامل اس میں پیدا ہوا جس نے خود کو کبھی غیر معمولی آدمی بھی نہ سمجھا۔ اخلاق میں، عادات میں، برتاؤ میں، مروّت میں، فیاضی میں اعلیٰ درجہ کا اعتدال تھا۔ عزیزوں اور اولاد کی محبت، تعلیم کا خیال، عالم کی خیر خواہی، نیک آدمیوں کی قدر دانی میں اُن کی مثال ضرور ملے گی مگر کم۔ آخری عمر میں جبکہ دماغ بیکار ہو گیا تھا اور لوگ اپنی عادت کے موافق مختلف خیالات سے جنگ کی خبروں کا ذکر کرتے تھے تو مولانا مرحوم جب بہت سے آدمیوں کے مقتول ہونے کا ذکر سنتے تھے تو اس قدر تاسف سے آہ

کرتے تھے گویا خود اپنے کسی عزیز کے مرنے کی خبر سنی ہو۔
خدمت گار روتے ہیں کہ ایسا آقا دیکھا نہ تھا، یہی حالت رشتے
داروں اور اہلِ شہر کی ہے قوم میں ابھی کچھ کم افسوس نہ
ہوگا۔"

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؕ

سیرت
قصص و واقعات
کے آئینے میں

غدر ۱۸۵۷ء سے دو تین سال قبل کا واقعہ ہے جب کہ مولانا کی عمر بیس سال کے قریب تھی اور دہلی میں طالب علم تھے۔ آپ نے ایک رسالہ بزبان عربی تصنیف کیا جو کسی منطقی مسئلہ کے متعلق تھا اور جس میں مولوی سید صدیق حسن خان صاحب مرحوم (نواب بھوپال) کے خیال کی تائید کی گئی تھی۔ مولانا نے اس رسالے کو اپنے اُستاد کے سامنے پیش کیا جو ایک مشہور حنفی عالم اور مدرسہ حسین بخش میں معلم تھے۔ وہ اس رسالے کو پڑھ کر اس قدر ناراض ہوتے کہ اس کو چاک کر دیا۔ مگر بعد میں کہا کہ رسالہ نہایت لیاقت سے لکھا گیا تھا۔
مولانا کی انصاف پسندی کی یہ پہلی مثال ہے جس کا ہم کو علم ہے۔
(غلام الحسنین، حالی، نقوش ص ۲۸)

حکیم محمود خاں، سرسید کے مخالف تھے۔ اسی وجہ سے مولانا کے تعلقات کشیدہ رہے۔ مگر باوجود اس کے حکیم صاحب کی واقعی خوبیوں کو نہایت خوبی سے ظاہر کرتے ہوتے درد انگیز مرثیہ لکھنے میں بخل سے کام نہیں لیا۔
(نقوش، شخصیات نمبر ص ۲۹)

کسی کی غیبت مولانا کی زبان سے نہیں سُنی گئی۔ اگر کسی شخص کا واقعی عیب اُن کے سامنے بیان کیا جاتا تو اُس کی نرم تاویل کرتے تھے۔ بچوں سے خاص کر بہت

محبت اور ہمدردی رکھتے تھے۔ اُن کو کبھی یہ بات گوارا نہ تھی کہ ماں کسی بچے کو ڈرائے دھمکائے یا اس کے ساتھ سختی سے پیش آئے۔ مارنے پیٹنے کا تو ذکر ہی کیا۔

میری والدہ مرحومہ کا قول تھا:

میرے ماموں پر تو سات مائیں قربان ہیں۔

(نقوش، ص ۳۴)

خواجہ عبدالمجید دہلوی کہتے ہیں:

"حالی صاحب کی خدمت میں حاضر تھا، سامنے سے شفیع (خواجہ محمد شفیع دہلوی) کھیلتا ہوا گزرا، میں نے 'تُو' کہہ کر مخاطب کیا۔ بولے تم اس کو 'تُو' کہہ کر نہ پکارا کرو۔ بچوں سے اس طرح نہیں بولنا چاہیے، اس سے ان میں سیلف رسپکٹ کم ہو جاتی ہے۔"

(کیا خوب آدمی تھا ص ۲۱)

غلام الحسنین صاحب کہتے ہیں:

"مولانا کی گفتگو نہایت نرم ہوتی تھی۔ میں نے کبھی اُن کی زبان سے کوئی ایسا کلمہ نہیں سنا جس سے کسی کے دل کو دکھ پہنچے — نوکروں کے ساتھ بھی اس کا برتاؤ برادرانہ تھا۔ کسی ملازم کو ڈانٹتے دھمکاتے نہ تھے۔ اگر کبھی اتفاقاً ایسی صورت پیش آجاتی تو اُن کی دھمکی بھی ہمدردی کا پہلو لئے ہوتی تھی۔

غصہ اول تو آتا نہیں تھا اور کبھی آتا تھا تو بھی زبان قابو میں رکھتے تھے۔

ان کا ایک ملازم عطاء اللہ جو لنگڑا، لولا، بہرہ اور تیز مزاج تھا اور اس قدر چیخ چیخ کر بولتا تھا جیسے لڑتا ہو، اس کے ساتھ

بھی کبھی سختی کا برتاؤ نہیں کیا۔ میرے سامنے کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ مولانا نے کسی چیز کی بابت عطاءاللہ سے پوچھا کہ فلاں چیز کہاں ہے؟

تو اُس نے اپنی عادت کے مطابق نہایت سخت اور کرخت لہجے میں کہا:

"یہ کیا دھری ہے!"

مولانا نے اس سے تو کچھ نہ کہا مگر مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"دیکھتے ہو عطاءاللہ کس طرح بولتا ہے! اس کا مطلب یہ ہے کہ کیا تو اندھا ہے اور یہ چیز تجھے نہیں سوجھتی؟"

(نقوش ص ۲۴)

۱۹۰۵ء حیدر آباد کا ایک واقعہ:

ایک صاحب جو علی گڑھ کے گریجویٹ اور حیدر آباد میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے مولانا سے ملنے آئے۔ ٹم ٹم پر سوار تھے، زینے کے قریب اُترنا چاہتے تھے۔ سائیس کی جو شامت آئی تو اُس نے گاڑی دو قدم آگے جا کر کھڑی کی۔ یہ حضرت اِس ذرا سی چوک پر آپے سے باہر ہو گئے اور سائیس کی ہنٹر اُس غریب کے رسید کر دیئے۔ مولانا یہ نظارہ اُوپر برآمدے میں کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اس کے بعد وہ کھٹ کھٹ سیڑھیوں پر سے چڑھ کر اُوپر آئے۔ مولانا سے ملے، مزاج پُرسی کی اور کچھ دیر باتیں کر کے رخصت ہو گئے۔ میں دیکھ رہا تھا، مولانا کا چہرہ بالکل متغیر تھا۔ وہ برآمدے میں ٹہلتے جاتے تھے اور کہتے تھے ــ "ہائے ظالم نے کیا کیا" اُس روز کھانا بھی اچھی طرح نہ کھا سکے۔ کھانے کے بعد ٹہلنے کی عادت تھی، وہ بھی نصیب نہ ہوا۔ فرماتے تھے:

"یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ہنٹر کسی نے میری پیٹھ پر مارے ہیں۔"
(عبدالحق، ہم عصر، داستان تاریخ اردو ص ۵۳۵، طبع دوم)

ایک لالہ صاحب نے اپنے کاروبار کے لئے مولانا سے قرض مانگا، رقم زیادہ تھی، مولانا کے پاس روپیہ نہیں تھا۔ اُنہوں نے اپنے ایک عزیز بطور قرض حسنہ دلوادیا جو بعد میں ادا ہو گیا۔ یہ لالہ صاحب میرے بہت پرانے شاگرد ہیں اور اس وقت ان کی مالی حالت اچھی ہے۔ وہ مجھ سے کئی مرتبہ اس واقعے کا ذکر کر چکے ہیں اور علی الاعلان کہتے ہیں کہ :

"مجھے تو حالی صاحب نے بنا دیا"

فرید آباد میں :

"ایک مرتبہ مولوی صاحب کا ناواقف نوکر خط بنوانے کے لئے ایسے نائی کو لے آیا جو اگرچہ خاندانی حجام اور موروثی کسوت سے بھی آراستہ تھا لیکن حقیقت میں ایک نشے باز، آوارہ مزاج سا آدمی تھا، خط بناتے بناتے کہنے لگا :

"اجی میاں مولوی صاحب! ایک کام تو آپ ہمارا بھی کر دیجئے!" اور کام یہ بتایا کہ "حضور! میرا ایک عورت پر دل آ گیا ہے مگر اُس کے بھائی بندوں نے بہکا دیا، شادی نہیں کرتی ـــــ حضور کوئی ایسا تعویذ لکھ دیں ـــــ کہ اپنے آپ میری خوشامد کرتی پھرے ـــــ!"

مولوی صاحب کو بہت ہنسی آئی مگر ضبط کیا اور نام پتہ وغیرہ دریافت کر کے فرمایا "گھبراؤ نہیں، تمہارے لئے ہم کوئی تدبیر کریں گے۔"

پھر جب محلے کے ذی وجاہت لوگ مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو مرحوم نے بہت شدّومد سے چھٹو نائی کی سفارش کی اور جب تک اُنہیں یہ یقین نہ دلایا گیا کہ اس کے ساتھ شادی کرنا بیچاری عورت کو مصیبت میں پھنسانا ہے

وہ چھٹو کی وکالت کرتے رہے "

(سیر المصنفین (حاشیہ) ج ۲ ص ۳۵۹ بحوالہ علی گڑھ میگزین ۱۹۲۴ء)

اسلم میرٹھی :

۱۹۱۰ء میں خواجہ غلام الثقلین بی-اے، ایل ایل بی ایڈوکیٹ جو خواجہ حالی کے نواسے تھے اور میرٹھ میں وکالت کرتے تھے۔ مولانا کو اُن سے بہت اُنس تھا۔ خواجہ صاحب ان دنوں غلام الثقلین کے یہاں مقیم تھے۔

ایک دن مولانا اکیلے بیٹھے تھے۔ اسلم صاحب نے اپنے والد محمد اسمٰعیل صاحب کی غزلیں سنانے کی اجازت مانگی اور طرز قدیم کی غزلیں سُن کر بہت داد دی۔ ان شعروں میں یہ شعر سُنا :

بس اسے رنگ و بُو تو نہ کر ناز بے حیا
خدا جانے کیا بات ہم دیکھتے ہیں !

خواجہ صاحب نے بآواز بلند کہا — خوب — سبحان اللہ! پھر پڑھئے — دوبارہ پڑھ کر جب اگلا شعر پھر شروع کیا — نہیں اسی شعر کو پڑھئے۔ بہت خوب شعر ہے — غالبؔ کی زمین میں ایک شعر سُنا :

خوفِ ناکامی ہے جب تک کامیابی ہے محال
مشکلیں جب بندھ گئی ہمت سب آساں ہو گئیں

جب محمد اسلم صاحب واپس آنے لگے تو کہا :

" مولانا کا کلام نہایت پختہ ہے۔ وہ مسلّم الثبوت اُستاد ہیں ہماری جانب سے کہئے گا کہ مولانا! اس غزل کا مطلع ضرور لکھ دیں!"

(مقدمہ کلیات اسمٰعیل ص ۹۶ طبع ۱۹۳۹ء)

حالیؔ — فکر و فن

حالیؔ کی نیچرل شاعری

پس منظر

ہر قوم کے عظیم کلاسیکی ادب کی طرح ہمارا قیمتی ادبی ذخیرہ بھی طویل تاریخی ارتقا اور تہذیبی اسباب کے ہاتھوں دنیا تک پہنچا۔ اسلامی تہذیب کے ایک ہزار سال کا مطالعہ کیا جائے تو صاف دکھائی دے گا کہ سندھ و ہند کے باشندے جس مصنوعی چار دیواری میں مقید تھے۔ اس نے مسلمانوں کے آتے ہی کس طرح آزادی اور پھیلاؤ حاصل کیا۔ مسلمانوں کے ہر قافلے نے یہاں ایک نئی روایت اور نئی روشنی پیدا کی۔ عرب، افغان، ترکی، ترکستان، ایران وغیرہ کے خاندان آباد کئے۔ ان آباد ہونے والوں کی اکثریت کسی فاتح کے ساتھ آنے والے سپاہیوں، سرداروں اور تاجروں سے مرکب تھی۔ کچھ لوگ تبلیغ کے لئے آئے اور بے تلوار کے جہاد کرنے آئے۔ کچھ لوگ لڑتے بھڑتے دُور دراز علاقوں میں چلے گئے اور جہاں ٹھیرے وہیں رہن سہن اختیار کر لی۔

یہ آبائی سپاہ پیشہ افراد فاتحانہ زندگی بسر کر کے اولاد کے لئے فخر کا سرمایہ چھوڑ گئے۔ بہت سے خاندانوں کے بزرگ بادشاہوں کی اولاد تھے۔ ان بادشاہوں نے اپنے خاص و عام ضوابط مقرر کئے تھے جو اُن کے خاندانوں میں کسی نہ کسی طرح روایت چلے آ رہے ہیں۔ تاریخی لحاظ سے قوم کا یہ وراثتی سرمایہ احساس خود داری، قومی برتری اور وطن کی سربلندی کا نشان ہے۔

اجنبی راج سے پہلے ہمارے ملک میں ریاست و سیاست کے نجی روزمرہ میں یہ تھا کہ شرفاء، اُمراء، شہزادے اور بادشاہ قصّے کہانیوں کی کتابیں پڑھتے اور سنتے تھے۔

کلیلہ دمنہ ۔ انوار سہیلی ۔ گلستان سعدی ۔ بہار دانش ۔ شاہ نامہ ۔ سکندر نامہ۔ وغیرہ ۔۔۔ حکمرانوں کے لئے محض دل کا بہلاوا ہی نہیں بلکہ ضابطے کی کتابیں

تھیں۔ بادشاہوں کے خود نوشت روزنامچے یا توزک، وفادار کی تالیفیں شاہی کتاب خانوں میں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ دربار کے علماء توزک تیموری، توزک بابری، ظفرنامہ پڑھتے اور اپنے معلومات و علم کے مطابق اس پر تقریریں کرتے تھے۔

کہانیوں کے پیرائے میں سیاست کی تعلیم اور افسانوں کے ذیل میں فتوحات حاصل کرنے کی تشریح مراد تھی۔ بادشاہوں کی پسندیدہ سیرت اور اُن کی تاریخ سے اخلاقی اسباق دیے جاتے اور عدل و انصاف کی اہمیت پر اخلاق ناصری، اخلاق جلالی اور آگے بڑھ کر احیاء العلوم کے بعض حصے دیکھے جاتے تھے۔ یہ مواد ٹھوس اور سنجیدہ سمجھا جاتا تھا۔ محنت کوش اور جفاکیش افراد شاہ نامہ، حملۂ حیدری جیسے ضخیم دفتروں کا مطالعہ کرتے تھے۔ ایسی داستانیں سُنتے تھے جن میں صحرانوردی، ہفت خوان طے کرنے، جُوئے شیر نکالنے، وِل کامل کی تلاش میں کامیابی کا حال ہوتا تھا۔ طلسمات کی فتح، طلسماتی شہروں کا سراغ، سوداگروں کی شاہی، شہزادوں کی تباہی کا حال ہوتا تھا۔ ان واقعات سے ترقی پسندوں کے لئے ہمت کا پیام پھیلانا مقصود تھا۔ نئے شہروں کی دریافت، نئے ملکوں میں جانے اور فائدے اُٹھانے کے جذبات اُبھرتے تھے۔

مثنوی مولانا روم، حدیقۂ سنائی، منطق الطیر عطار، کیمیائے سعادت، احیاء العلوم غزالی کا مطالعہ بھی روحانی تربیت اور اخلاقی اصلاح کا ذریعہ مانا جاتا تھا۔

لوگوں کا خیال تھا کہ مملکت کا دارومدار عدل و انصاف پر ہے۔ ظلم و ستم بادشاہی کی تباہی کا باعث ہے۔ رحم و عفو و درگزر سے رعایا خوشحال ہوتی ہے۔ ان نظریات و تصورات نے ادیبوں کو متاثر کیا۔ ان کے قصیدے صرف انعام حاصل کرنے کے لئے ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ ان کا مقصد تخت و تاج کی خدمت بھی تھی۔ خیال تھا کہ شاعر کے قصیدے مضبوط قلعوں اور شاندار عمارتوں کی طرح بادشاہ اور حکومت کی نیک نامی کا باعث ہے۔

غزل میں اِنہی تہذیبی علامتوں کی نمائندگی ہوتی ہے۔ ظالم و مظلوم، تیر و تلوار، مارنا جلانا جیسے استعارے ملک کی عام زندگی سے مستعار ہیں اور اخلاق و تصرف کے

کے خیالات، اعلیٰ تہذیبی اقدار کی نشان دہی کرتے ہیں۔

غزل کی بات آگئی تو یہ بھی یاد دلاتا چلوں کہ غزل اپنی ہیئت، مواد اور کیفیت کے لحاظ سے ہمیں ایرانی ثقافت سے براہ راست دستیاب ہوئی ہے۔ اس کے علامات و رموز مدت دراز تک بعینہٖ وہی رہے جو حافظ و سعدی نے عطا کئے تھے۔ برصغیر میں غزل کی تبدیلیاں بے شک ایران سے مختلف ہیں لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ ان تبدیلیوں کا سبب خود فارسی گو شعرا تھے۔ خواہ وہ صائب و عُرفی و نظیری ہوں یا بیدل اور غالب، یہ حضرات ماحول کی پیدا شدہ حالتوں سے متاثر ہوتے ہوں یا اپنی طبیعت کی اُفتاد اور ذہن کی جدت پسندی سے، بہرحال وہ روایت سے بغاوت نہ کر سکے۔ ہاں چراغ سے چراغ ضرور روشن ہوئے۔

عُرفی، نظیری، ظہوری، بیدل وغیرہ نے غزل کے علاوہ دوسرے اصناف سخن پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان لوگوں نے قصیدے، قطعے لکھے۔ بعض نے مثنویاں بھی لکھی ہیں۔ لیکن ان کا سارا فن واضح طور پر اپنی تہذیب و روایت کا نمائندہ ہے۔ وہی تصوف، وہی خاص قسم کا فلسفہ، وہی عاشق و معشوق، کوچہ و آستاں وغیرہ۔

محمد شاہ تک شاعروں کو براہ راست زندگی کے پیش یا اُفتادہ مسائل سے حسیاتی طور پہ توجہ دینے کا شعور حاصل نہ تھا۔ مجھے دکن کے قطب شاہ، دلّی کے صدرالدین خاں فائز جیسے چند شعرا کے کلام و کمال کے استثنیٰ کی ضرورت نہیں۔ یہ لوگ بے شک عوامی زندگی اور روزمرہ مشاغل کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھ چکے ہیں لیکن میلے ٹھیلے، جشن اور سوگ کے موضوعات پر چند نظمیں، چند آدمیوں کے ضمنی شعور کا پتہ تو دیتی ہیں مگر یہ شعور اتنا دبا دبا اور گھٹا گھٹا ہے کہ خود ان فن کاروں پر دیرپا اثر قائم نہ کر سکا تو ادب اور ادیبوں کو متاثر کرنے کی قوت کہاں سے آتی؟

اس عہد میں دنیا سمٹ گئی تھی، ماحول منجمد ہو چکا تھا۔ نہ تلواروں کا لوہا گرم ہوتا تھا نہ خون کی گردش ہوتی تھی۔ سکوت اور غیر متحرک زندگی جیسے معاشرہ چار دیواری میں بند ہو گیا ہو۔ ہر شخص پہ عجیب کیفیت طاری تھی ـــــ کوئی حال مست تھا ـــــ کوئی مال مست۔

نادر شاہ کے حملے (۱۱۵۱ھ) اور احمد شاہ ابدالی کی لوٹ (۱۱۶۱ھ) پھر مرہٹوں کے طوفان نے دلی کا دل دہلا دیا۔ لوگ کلیجہ تھام کر بیٹھ گئے۔ زمین کے اندر سے ایک لاوا نکل کر سطح کے ہر نشان کو مٹا کر کسی رخ نکل گیا۔ ایک آندھی تھی جس کی قیامت خیز رفتار نے تمام اونچے محل گرا دیئے، ہر بساط کو الٹ دیا، بندھے بندھائے قاعدے درہم برہم کر دیئے، بڑے چھوٹے ہو گئے، چھوٹوں نے بڑوں کی مسندیں سنبھال لیں۔ معاشرے کے مرکز میں انقلاب آ گیا۔ ایسا انقلاب جو اجنبیوں کے ہاتھوں آیا اور ملک کے نظام کو پہلے سے بدتر بنانے کے لئے آیا۔ حملہ آوروں نے تخت و تاج پر قبضہ کیا، خزانہ حاصل کیا، لونڈیاں، غلام جمع کئے اور محمود کی طرح اپنے وطن لوٹ گئے۔

حکومت اور عوام نے شکست کی شرم محسوس تو کی مگر اس کا مداوا نہ کر سکے، کمزوری اور بے دست و پائی کا شکار رہے، دشمن کا تعاقب کیا کرتے اور شکست کا انتقام کیا لیتے۔ اس انفعال نے پوری قوم کو گہرے غار میں ڈھکیل دیا۔ ایسے موقعوں پر آدمی دو قسم کے اثر لیتا ہے یا دل ٹوٹ جاتا ہے ـــــ یا دل الٹ جاتا ہے ـــــ جس کا دل ٹوٹ جائے وہ روتا رہتا ہے، خاموش ہو جاتا ہے۔ کسی سے بات کرنا پسند نہیں کرتا۔ گزرے ہوئے دن یاد کر کے اس کا کلیجہ پھٹتا ہے۔ بات بات پر غصہ کرتا ہے۔ خود آہیں بھرتا اور دوسروں کو رلاتا رہتا ہے۔ ان لوگوں میں شاعر حساس زیادہ لطیف ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا تاثر بھی شدید ہوتا ہے۔ ان شاعروں میں ہمیں میر تقی میر سرفہرست نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری اس دور کی آہ اور کراہ ہے:

اے ہم نشیں کسو کے مت عشق کی ہوس کر
جاتی ہیں یونہی ناداں جانیں ترس ترس کر
فرصت سے اس چمن کی کل رو کے میں جو پوچھا
چشمک کی ایک گل نے میری طرف کو ہنس کر
ہم موئے ناتواں تھے سو مر چکے ہیں کب کے
نکلے ہو تم پیارے کس پر کمر کو کس کر

جی رُک گیا کہیں تو پھر ہووے گا اندھیرا
مت چھیڑ ابر مجھ کو یوں ہی برس برس کر

اک جمع کے سر اوپر روز سیاہ لایا !!
پگڑی میں بال اپنے نکلا جو وہ گھر بس کر

اس قافلے میں کوئی دل آشنا نہیں ہے
ٹکڑے گلے کے اپنے ناحق نہ اے جرس کر

صیّاد اگر اجازت گلگشت کی نہیں ٹک
دیوار باغ کو تو بارے در قفس کر

بے بس ہے میرؔ تجھ بن رہتا نہیں دل اس کا
ٹک تو بھی اے ستم جو، جور و ستم کو بس کر

یہاں میرؔ کے نفسیات اور اس کی شاعری پر بحث کرنا مقصود نہیں، صرف یہ بات بتانا چاہتا ہوں کہ اٹھارھویں صدی کی شکست و ریخت نے دلوں کا کیا عالم کر دیا تھا اور شاعر کس طرح سوچ رہے تھے :

آہ شرر فشاں جو نکلے ہے منہ سے ہر دم
روشن ہے میرؔ غم نے قلب و کبد جلائے

جمع افگنی سے ان نے ترکش کئے ہیں خالی
کس مرتبے میں ہوگی سینوں کی خستہ حالی

دلّی میں بہت سخت کی اب کے گزران دل کو کر سنگ
غیرت نہ رہی عاقبت کار نہ شان کھینچا یہ ننگ
یاروں میں نہ تھا کوئی مروّت جو کرے اُجڑے تھے گھر

تا حدِ نظر صاف پڑے تھے میداں عرصہ تھا تنگ

سوداؔ کی غزل اور قصیدے سے آگے بڑھ کر قطعات و منظومات دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان پر ان سانحوں نے کیا اثر کیا۔ "تضحیکِ روزگار" میں اُنہوں نے ایک گھوڑے کا حال لکھتے ہوئے کہا ہے :

ہے چرخ جب سے ابلق ایام پر سوار
رکھتا نہیں ہے دست عناں کا بیک قرار
جن کے طویلے بیچ کئی دن کی بات ہے
ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار
اب دیکھتا ہوں مَیں کہ زمانے کے ہاتھ سے
موچی سے کفش پا کو گٹھاتے ہیں وہ اُدھار
تنہا دہی نہ دہر سے، عالم خراب ہے
خست سے اکثروں نے اُٹھایا ہے ننگ و عار

دو چار شعر اپنے مہربان کی شان میں لکھ کر اُن کے فرسِ با وقار کی بے مثال تعریف و تضحیک کرتے ہوئے کہتے ہیں :

دہلی تک آن پہنچا تھا جس دن کہ مرہٹہ
مجھ سے کہا نقیب نے آکر ہے وقت کار
مدت کی ڈلیوں کو اُڑایا ہے گھر میں بیٹھ
ہو کر سوار اب کرو میداں میں کارزار
ناچار ہو کے تب تو بندھایا میں اس پہ زیں
ہتھیار باندھ کر میں ہوا جا کے پھر سوار
جس شکل سے سوار تھا اُس دن میں کیا کہوں
دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار

چابک تھے دونوں ہاتھ میں پکڑے تھامنہ میں باگ
تک تک سے پاشنے کے مرے پاؤں تھے فگار

پھر گھوڑے کا حال تقریباً اسی انداز میں لکھا ہے جیسے پطرس نے "مرزا کی بائیسکل" میں کسی شریف آدمی اندا اس کی سائیکل کا متحرک نقشہ اتارا ہے۔ سودا کی لاأبالی طبیعت اور خوش باش فطرت کا تقاضا تھا کہ وہ ہر سانحہ پر زہر خند کرتے ہیں۔ یہ زہر خند غیر ارادی نہیں بلکہ جان بوجھ کر وہ اس المیہ کے بیان کا آغاز ہی یوں کرتے ہیں :

"جو میں کہوں گا تو سمجھے گا تو کہ ہے یہ ٹھٹھول"
سپاہی رکھتے تھے نوکر، امیر دولت مند
سو آمد اُن کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے ملک کو مدّت سے سرکشوں نے پسند
جو ایک شخص ہے بائیس صوبے کا خاوند
رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداری کول

قوی ہیں شہر میں مفسد، امیر ہیں سو ضعیف
ٹلکے کہاں جو ہمیں دے کے ہوں انہوں سے حریف
نہ کچھ ربیع سے حاصل نہ درمیان خریف
جو عامل اب ہیں محالات پر سو لیں ہیں ضعیف
کہ جس طرح کسی حاکم کے گھر گنوار ہو اول

یہ داستانِ غم، قوم کے زوال کا عالم، افراد کی تباہی، عوام کی بدحالی، خواص کی کسمپرسی بیان کرتے کرتے آخر خول کے آنسو نکل آئے :

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس
کہ جسکے دیکھے سے جاتی رہے تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہوئے زندگی سے اداس
بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس

کہیں ستون پڑا ہے، کہیں ڈھئی مرغول

شرفاء کا حال سُنیئے :

دیا بھی واں نہیں روشن، تھی جس جگہ فانوس
پڑے ہیں کھنڈروں میں آئینہ خانے کے ماؤس
کروڑ دل پُر از امید ہو گئے مایوس!
گھروں سے یوں نکلا کے نکل گئی ناموس
رہی نہ ڈولی انہیں جو تھے صاحب چنڈول

نجیب زادیوں کا ان دنوں ہے یہ معمول
وہ برقعہ سر پہ ہے جس کا قدم تلک ہے طول
ہے ان کی گود میں لڑکا گلاب کا سا پھول
اور ان کے حسنِ طلب کا ہر ایک سے یہ اصول
کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو لیجئے مول

غرض میں کیا کہوں یارو کہ دیکھ کر یہ قہر
کروڑ مرتبہ خاطر میں گزرے ہے یہ لہر
جو ٹک بھی اس دل کو اپنے دلیے گر تو زہر
تو بیٹھ کر کہیں یہ روئیے کہ مردم شہر
گھروں سے پانی کو باہر کریں جھکول جھکول

شیدی فولاد خاں کو توال شاہ جہاں آباد کی ہجو میں کلیات کی نویں مثنوی کا ابتدائیہ بھی معاشرے کی تباہ حالی پر روشنی ڈالتا ہے۔ ان اشعار کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انقلاب اور ہنگاموں سے شاعر غفلت نہیں برت سکتا :

کیا کہتا یارو وہ نسق ہیہات!
لیموں کے چور کا کٹے تھا ہات
باندھا جاوے تھا دُزدِ پگڑی کا!

مارا جاوے تھا دزد گگڑی کا
شہر میں کیا رہے تھا امن و امان
کیسی کرتی تھی خلق خوش گزران
تھا نہ رشوت سے کوتوال کو کام
شہر میں تھا نہ چوٹے کا نام
اب جہاں دیکھو، واں جھگڑا ہے
چور ہے ٹھگ ہے اور اُچکا ہے
دیکھی ہم نے جو راہ چاوڑی کی
پشم ہے رہزنی تلاوڑی کی
خاص بازار کا جو سنئے بیان
اُن نے نزدک کے کاٹ ڈالے کان
دمڑی کے سودے کو جو واں جاوے
پگڑی کھو، سر کو پیٹتا آوے

جزئیات نگاری، باریک بینی، ماحول اور معاشرے کی منظر کشی کی ان خوبصورت مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ میر اور سودا کے زمانے میں حقائق پر نظر تھی۔ فطری احساسات کی ترجمانی ہوتی تھی۔ ایک ہلکی سی موج سطح پر اُٹھتی اور بیٹھ جاتی تھی۔ شاعر اپنے ماحول کے نئے تقاضوں سے متاثر ہوتا تھا مگر تقاضوں میں قوت نہ تھی۔ معاشرے میں ایک طبقہ ایسا تھا جہاں ان حقائق کو مجاز سمجھا جاتا تھا۔ دولت اور عیش کے سائے میں شاعر کو پناہ مل جاتی تھی۔ اس کے باغیانہ خیالات کو سونے چاندی کے سکّے سست کر دیتے تھے۔ وظیفوں کی چاٹ، درباروں میں رسائی حاصل ہونے کی وجہ سے وہ غمِ دوراں کو بھول جاتے تھے۔ عوام کو چیخنے کی اجازت نہ تھی۔ حقوق کا مطالبہ کرنے کا خیال نہ تھا، اقدار کا مفہوم متعین اور واضح نہ تھا۔ وقت کو ایک نئے انقلاب کا انتظار تھا۔ ادب کی نظر میں سماجی نظام کمزور اور جاں بلب تو تھا مگر زندہ ضرور تھا۔ آخر آہستہ آہستہ یہ کمزوری

نزع تک لائی اور ۱۸۵۷ء میں پوری قوم کا معاشرتی نظام آخری ہچکی لیکر ختم ہو گیا۔

(۲)

انگریزوں نے ہمارے سماج میں اُترنے کی کوشش کی۔ وہ تدریجی طور پر تبدیلیوں کا منصوبہ بنا کر آتے تھے۔ اُنہوں نے پہلے عوام پر نظر ڈالی۔ تجارت سے زراعت تک کا میدان خالی پاکر ٹھیکیداریاں سنبھال لیں۔ ریاستوں کا حال سمجھ چکے تھے۔ اب سیاستوں میں پنجہ آزمائیاں کرتے لگے۔ برصغیر کے رہنے والوں نے اُن اجنبیوں کی چال نہ سمجھی۔ کلکتہ میں ان کی رہن سہن، کاروبار میں اُن کا معیار دیکھ کر ان سے مانوس ہوئے۔ ان کی فوجی برتری اور جنگی اصولوں سے مرعوب ہو گئے۔ عوام بکنے لگے اور خواص کا خوف بڑھتا چلا گیا۔ تاجروں کا یہ گروہ ملک کا بازار بن لگا کر بیٹھا۔ کمپنی نے ہمارے مروجہ علوم سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے تعلیمی اداروں کی بنیاد رکھی۔ سبطِ حسن صاحب کے الفاظ میں:

"ایسٹ انڈیا کمپنی ایک تجارتی ادارہ تھی۔ اس لئے کمپنی کے ملازموں کو ہر وقت اس ملک کے باشندوں سے واسطہ پڑتا تھا اور ان کی زبان اور طور طریقوں سے تھوڑی بہت واقفیت ضرور رکھنا پڑتی تھی۔ (محمد عتیق صدیقی، گل کرسٹ اور اس کا عہد، ص ۴۸) جنگ پلاسی کے بعد جب ۱۷۶۵ء میں بنگال، بہار اور اڑیسہ کے علاقے کمپنی کے زیر اقتدار آئے تو کمپنی کے ملازمین کے لئے رعایا کی زبان، مذہبی عقائد اور معاشرتی حالات سے آگاہی اور زیادہ ضروری ہو گئی۔ چنانچہ وارن ہیسٹنگز (۱۷۷۲ء — ۱۷۸۵ء) کے زمانے ہی میں ہیڈ سلے۔ ڈاکٹر بالفور۔ مسٹر ولکنس اور ڈاکٹر گل کرسٹ نے کمپنی کے انگریز ملازمین کی سہولت کے لئے لغت، گرامر اور زبان دانی کی کئی کتابیں مرتب کیں۔ کمپنی اپنے سول اور فوجی ملازمین کو ایک

> معینہ مدّت کے لئے تیس روپے ماہانہ "منشی الاؤنس" بھی دینے لگی تاکہ یہ لوگ منشیوں اور پنڈتوں سے ہندوستانی، فارسی اور دوسری زبانیں سیکھ لیں"۔
>
> (اُردو، کراچی، جنوری ۱۹۶۶ء)

ڈاکٹر گلکرسٹ نے کمپنی کی تحریک سے اُردو فارسی پڑھانا شروع کی، کچھ دنوں بعد ۱۰ جولائی سنہ ۱۸۰۰ء میں ایک تعلیمی ادارہ "فورٹ ولیم کالج" کی شکل میں وجود پذیر ہوا۔ فورٹ ولیم کالج کا مقصد برصغیر کی عوام فہم زبان اور تہذیب کا سمجھنا تھا۔ لہٰذا ایسا نصاب تیار کیا گیا جس کی تعلیم انگریز افسروں کو ہندوستانی بنادے۔ تصنیف و تالیف کے شعبے میں دہلی اور لکھنؤ سے مصنف بلائے گئے۔ اُن سے یہاں کی سادہ و عام فہم زبان میں کہانیاں لکھوائی گئیں، داستانوں پر توجہ کی۔ تاکہ مقامی کلچر اور طبقاتی نظام سمجھا جاسکے۔ شعروادب کے مجموعے چھاپے تاکہ کمپنی کے ملازم نثر کے ساتھ نظم کے نکات سے باخبر ہوجائیں۔ کچھ عرصے بعد فورٹ ولیم کالج ختم کردیا گیا اور دہلی میں ایک کالج کو اس کا قائم مقام بنایا۔ یہاں کا نصاب، تعلیم کا مقصد اور طلبا کی نوعیت فورٹ ولیم سے مختلف تھی۔ اب تاجروں کی کمپنی حکمرانوں کی ٹولی بن چکی تھی۔ انہیں اپنی ڈھب کے کلرک اور اپنے کام کے منشی درکار تھے۔ دلّی کالج انگریزی طرز کا کالج تو نہ تھا مگر انگریزی افکار، مغربی خیالات اور جدید رجحانات کی طرف ایک قدم ضرور تھا۔ یہاں ہندوستانی طلبا کو ان کے معاشرے کے عیوب دکھائے جاتے ہوں یا نہ مگر دلّی کالج کے فارغ التحصیل حضرات میں نئے تقاضوں کے سمجھنے کا شعور اور پُرانی قدروں کو نئے اسلوب سے پیش کرنے کا جذبہ بہر حال پیدا ہوگیا تھا۔ دلّی کالج کی وجہ سے زبان و بیان کی وسعتوں کا جائزہ لینے کی غیر شعوری تحریک شروع ہوئی۔ مولوی محمد باقر شہید کی ۱۸۳۶ء نے "دلّی اردو اخبار" نکال کر اس تجربہ کی پہلی شرط پوری کردی۔ لوگوں نے اپنی بات سمجھنے سمجھانے کے لئے صحافت کا لہجہ دیکھا، اپنی خواہشات بیان کرنے کے عوامی اثرات کا جائزہ لیا، سیاست و ریاست پر تنقید کرنے کی راہ نکالی۔ ادب کے رجحانات کی غیر شعوری اشاعت ہوئی شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد، دلّی کالج کے فارغ التحصیل تھے۔ اُن کے والد نے کالج میں پڑھا بھی

تھا اور پڑھایا بھی تھا۔ مولانا آزاد نے مولوی محمد باقر صاحب کی تربیت، دلی کالج کی تعلیم اور دلی اُردو اخبار کے ذریعے عملی تجربے حاصل کیے تھے۔ اتفاق سے ملک گیر ہنگامہ ہوگیا، اِس ہنگامے نے مولانا آزاد پر دُور رس اثر ڈالا۔ اُن کا گھر تباہ ہوگیا۔ اُن کے والد باغی قرار پاکر شہید کیے گئے۔ اُن کے شہر کو ان سے چھین لیا گیا۔ اُن کی روایت ختم کردی گئی۔ اُن کی قوم نے شکست پائی۔

غدر —— جس کے معنے ہیں انگریز کی حکومت ماننے سے انکار —— پوری قوم کے لئے نئی زندگی کا پیغام لائی۔ نئی حکومت اور اس کے مسائل سامنے آئے۔ پُرانے قانون قاعدوں، رسم ورواج کی شکست و ریخت کا سوال پیدا ہوا۔ ایک ڈگر پر چلنے والی زندگی نے ٹھوکر کھائی اور گری۔ حالات کہہ رہے تھے کہ یا ماضی کو یاد کرتے رہو اور مر جاؤ یا نئی زندگی کے لئے راہیں ہموار کرو اور آگے بڑھو۔ بے شعور افراد کا عالم یہ تھا کہ تخت تیمور کی قسم کھاکر جیتے تھے۔ اور وضع داری کے نام پر مرتے تھے۔ عام مسلمان غریب تھا اور انگریز کی نظر میں باغی بھی تھا اور ناقابلِ اعتماد بھی۔ مسلمانوں کی زبوں حالی دن بدن بڑھتی جاتی تھی۔ دولت دامن سمیٹ رہی تھی۔ پُرانے علم کی ناقدری تھی۔ نئے علوم سے ان کو نفرت تھی۔ سیاست سے نابلد تھے، مجبوری کو صبر سمجھ رہے تھے اور انگریز ان کے احساس کمتری کو مختلف طریقوں سے بڑھاتا جا رہا تھا۔

اس کشمکش میں کچھ بیدار مغز اُٹھے اور اُنہوں نے دو چار تحریکیں چلائیں۔ ان تحریکوں میں سرسید کی تحریک برگ و بار لائی۔ سرسید نے انگریز کو مسلمانوں کا موقف سمجھایا اور مسلمانوں کو مستقبل کے لئے علمی اور سیاسی بیداری کی طرف متوجہ کیا۔ سرسید کا منصوبہ ابھی بالکل ابتدائی مرحلوں میں تھا کہ لاہور میں ایک تعلیمی درسگاہ کھلی جو آہستہ آہستہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور دلی کالج کی جانشین ہوئی۔ یعنی دلی کالج کے اساتذہ اور افاضل گورنمنٹ کالج لاہور آگئے۔

لاہور، سکھوں کی حکومت میں برصغیر کے اسلامی کلچر سے دُور ہو گیا تھا۔ دلی اور لکھنؤ میں تہذیب و ثقافت پر جو کچھ ہو رہا تھا، لاہور کو براہِ راست اُس سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہاں سکھ حکومت اور سکھ اُمراء سکھ علوم کی ترویج اور سکھ ثقافت کی اشاعت میں مصروف تھے۔

لہذا انگریزی راج کے بھرپور قیام نے لاہور میں جو روشنی پیدا کی وہ اپنی نوعیت میں سب سے الگ تھی۔ لاہور میں پہلی جماعت سے مڈل جماعتوں کے لیئے جو نصاب تیار کیئے گئے، وہ فورٹ ولیم کالج کی کتابوں کی طرح ایک خاص تکنیک سے لکھا گیا۔ لاہور کے محکمہ ترجمہ میں مولانا حالی اور مولانا آزاد کی حیثیت وہی اہمیت رکھتی ہے جو کلکتہ میں میر شیر علی افسوس اور میر امن کی تھی۔ میر امن نے باغ و بہار جیسی تخلیق کی اور مولانا آزاد نے اُردو کی ریڈریں لکھیں۔ میر شیر علی افسوس اور حالی کا فنی مقابلہ تو نہیں کیا جا سکتا۔ مگر باختلاف نوعیت کار شخصی عظمت وہی ہے۔

سب سے بڑی بات شعری رجحانات تھے۔ لاہور میں انجمن پنجاب محکمہ تعلیم اور سرکاری اخبار میں انگریزوں کے ساتھ پنجاب کے دانشور بھی کام کر رہے تھے۔ شہر میں علمی اجتماعات ہوتے تھے۔ ان اجتماعات میں تقریریں اور مقالے پیش ہوتے تھے۔ مختلف مسائل پر بات چیت ہوتی تھی۔ مولانا محمد حسین آزاد ان تمام تحریکوں میں روح رواں تھے۔ وہ دلی کی ثقافت کے نمائندے اور دلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ نئے امکانات کے جائزوں سے باخبر تھے۔ لاہور میں محکمہ ترجمہ کے ذریعے سرسری طور پر انگریزی ادب کے کچھ مسائل اور مشرق و مغرب کے اختلافات فن سے آگاہی حاصل کر چکے تھے۔ اُن کے دل میں طرح نو کی تمنا تڑپ رہی تھی۔ ان کے مضامین اور تقریروں میں بار بار اس جدت آفرینی کی طرف توجہ پائی جاتی ہے[1]۔ ۱۸ اگست ۱۸۶۷ء کے لیکچر میں انتہائی کارآمد باتیں لکھتے ہوئے کہا ہے:

> "اُمید ہے کہ جہاں اور محاسن و قبائح کی تردید و اصلاح پر نظر ہوگی فن شعر کی اس قباحت پر بھی نظر رہے گی گو آج نہیں مگر اُمید قوی ہے کہ انشاء اللہ کبھی نہ کبھی اس کا ثمرۂ نیک حاصل ہو۔
>
> آزاد

تمہاری سینہ فگاری تو کوئی دیکھے گا
نہ دیکھے اب تو نہ دیکھے کبھی تو دیکھے گا

(نظم آزاد ص ۴۱، طبع ۱۹۵۷ء)

---

[1] مولانا آزاد کے مضامین اور خطبات کا بہت بڑا ذخیرہ محفوظ ہے۔ فاضل

۸ رمئی ۸۷۴ء تک مولانا آزاد فن شعر کی قباحتوں کا مداوا کرنے کی سوچتے رہے مضمون لکھے، تقریریں کیں۔ آخر ۸ رمئی ۱۸۷۴ء کے جلسۂ انجمن میں "نظم جدید" کا منشور لکھ کر لائے اور اپنے ساتھ کچھ شاعروں کے تجربے پیش کئے۔

ان مشاعروں میں پڑھی جانے والی نظمیں فنی طور پر "نیچرکی شاعری" کے نام سے یاد کی گئیں۔ نیچر کی شاعری، خود اس کے بانی و داعی کی نظر میں کیا تھی؟ آزاد اور حالی نے اس پر روشنی ڈالی ہے۔ آزاد چونکہ اس تحریک کے بانی اور داعی تھے۔ اس لئے وہ اس بارے میں مسلسل سوچتے رہے۔ انہیں جب بھی موقع ملا، مضامین لکھے۔ "نظم آزاد" کے آغاز میں ۱۵ راگست ۱۸۶۷ء کی ایک تقریر ہے۔ اس تقریر میں "نظم اور کلام موزوں" پر اپنے گہرے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا:

> امید ہے کہ جہاں اور محاسن و قبائح کی ترویج و اصلاح پر نظر ہوگی فن شعر کی اس قباحت پر بھی نظر رہے گی، گو آج نہیں مگر امید قوی ہے کہ انشاء اللہ کبھی نہ کبھی اس کا ثمرۂ نیک حاصل ہوگا۔
>
> تمہاری سینہ فگاری کوئی تو دیکھے گا
> نہ دیکھے اب تو نہ دیکھے کبھی تو دیکھے گا

فن شعر کی قباحت یوں بیان کی ہے:

> "البتہ فصاحت و بلاغت اب زیادہ ہے مگر خیالات خراب ہوگئے سبب اس کا سلاطین و حکام عصر کی قباحت ہے انہوں نے جن جن چیزوں کی قدر دانی کی، لوگ اس میں ترقی کرتے گئے۔"
>
> (نظم آزاد ص ۴۰ ببعد)

۱۸۶۷ء کے بعد ۱۸۷۴ء تک کے مضامین ابھی تک ہمارے سامنے نہیں آئے ورنہ آزاد کے ترقی پسندانہ خیالات کا حال معلوم ہوتا۔ ۸ رمئی ۱۸۷۴ء کو جو لیکچر "نیچر کی شاعری" کے مشاعرے کا آغاز کرتے ہوئے پیش کی تھی، وہ دراصل نئی شاعری کا منشور

تھا۔ اس لکچر میں اُنہوں نے ہندوستانی تاریخ و ثقافت کے ادبی پس منظر کا سرسری ذکر کرنے کے بعد اُردو ادب کا حال بیان کیا ہے۔ اسی ذیل میں چند اہم نکتے یہ لکھے ہیں :

(ا) " اے میرے اہلِ وطن! مجھے بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ عبارت کا زور، مضمون کا جوش و خروش اور لطائف و صنائع کے سامان تمہارے بزرگ اس قدر دے گئے کہ تمہاری زبان کسی سے کم نہیں، کمی فقط اتنی ہے کہ وہ چند بے موقع احاطوں میں گھر کر محبوس ہو گئے ہیں "۔

(ب) " کوئی واقعی سرگزشت یا علمی مطلب یا اخلاقی مضمون نظم کرنا چاہیں تو اس کے بیان میں بدمزا ہو جاتے ہیں "۔

(ج) " کیسی حسرت آتی ہے جب میں زبان انگریزی میں دیکھتا ہوں کہ ہر قسم کے مطالب و مضامین کو نثر سے زیادہ خوبصورتی کے ساتھ نظم کرتے ہیں اور حق یہ ہے کہ کلام میں جان ڈالتے ہیں "

(د) " ہمارے بزرگ ردیف قافیے کے ساتھ ایسی دلپسند تحریریں اور نازک خیالیوں کے سامان ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں کہ اگر ہمّت کریں تو کسی سے پیچھے نہ رہیں "

(ہ) " اُٹھو! اُٹھو! وطن اور اہلِ وطن کی قدیمی ناموری کو بربادی سے بچاؤ"، تمہاری شاعری جو چند محدود احاطوں میں بلکہ زنجیروں میں مقیّد ہو رہی ہے۔ اس کے آزاد کرنے میں کوشش کرو۔ نہیں تو ایک زمانہ تمہاری اولاد ایسا پائے گی کہ اُن کی زبان شاعری کے نام سے بے نشاں ہو گی "۔

(و) " اے خاکِ ہندوستان! اگر تجھ میں اُمراء القیس اور لبیدؔ نہیں تو کوئی کالیداس ہی نکال۔

اے خاکِ ہندوستان! فردوسی و سعدی نہیں تو والمیک ہی

پیدا کر دو!"

(نمبر۱) "شاعری کے لئے اوّل قدرتی جوہر، بعد اس کے چند تحصیلی اور علمی لیاقتیں چاہئیں۔ بعد اس کے شوق کامل اور مشق دوامی۔"

مولانا آزاد کے خیال میں اُردو کی صلاحیتوں میں کمی نہیں ہے۔ اگر شاعر توجہ کریں تو عاشقانہ وصوفیانہ خیالات کے علاوہ بھی کچھ لکھ سکتے ہیں۔ عشق آمیز فلسفۂ اخلاق کے بدلے ہر قسم کے مضامین نظم ہو سکتے ہیں۔ ردیف قافیے کے ساتھ دل پسند بحروں میں لکھا جائے اور کالیداس و دوالمیک پیدا کئے جائیں۔ امراء القیس، لبید، سعدی اور فردوسی کا نام لے کر مولانا آزاد واضح طور پر اپنی روایت کو پیش نظر رکھنے کا اعلان کرتے ہیں۔ اُن کے سامنے نظیر اکبرآبادی، میرحسن، انیس، مرزا شوق ہیں مگر وہ اپنے کام کی بنیاد قائم کرتے وقت ان کا نام نہیں لیتے۔ شاید اُن کے خیال میں قدیم اساتذہ کے اسلوب پر انگریزی خاکے بھرے جانے کی تجویز تھی۔

حالی کا نصب العین سمجھنے کے لئے مقدمہ کی یہ عبارت بہت کچھ تفصیل بتاتی ہے ظاہر ہے کہ مقدمہ میں نیچرل شاعری پر خواجہ صاحب کا یہ بیان تقریباً اٹھارہ برس بعد کے خیالات کا ترجمان ہے۔ لیکن اس عہد کے تصوّرات اور حالی کے نظریے میں کوئی تبدیلی شاید ہی ہوئی ہو۔ خواجہ صاحب لکھتے ہیں :

"نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً و معناً دونوں حیثیتوں سے نیچر یعنی فطرت یا عادت کے مطابق ہو۔

لفظاً نیچرل کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور اُن کی ترکیب و بندش تا بمقدور اس زبان کی معمولی بول چال کے موافق ہو جس میں وہ شعر کہا گیا ہے۔ کیونکہ ہر زبان کی معمولی بول چال اور روزمرہ اس ملک والوں کے حق میں جہاں وہ بولی جاتی ہے نیچر یا سکنڈ نیچر کا حکم رکھتے ہیں۔ پس شعر کا بیان جس قدر بے ضرورت معمولی بول چال اور

روزمرّہ سے بعید ہوگا اسی قدر اَن نیچرل سمجھا جائے گا۔
معناً نیچر کے موافق ہونے سے یہ مطلب ہے کہ شعر میں
ایسی باتیں بیان کی جائیں جیسی کہ ہمیشہ دُنیا میں ہوا کرتی ہیں۔
یا ہونی چاہئیں۔ پس جب شعر کا مضمون اس کے خلاف ہوگا وہ
اَن نیچرل سمجھا جائے گا۔"
(مقدمہ شعر و شاعری طبع اوّل ص ۹۱)

(۳)

اُردو کے ارتقائی پس منظر کا جائزہ لیجئے اور حالی کا کلام پڑھئے — معلوم ہوتا ہے جیسے گزشتہ تجربوں کی روشنی میں نیا تصویر تو اُبھرا ہے مگر اس کے مظہر میں فکری تنوع کے علاوہ کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ہیئت پرانی، خطوط عمل پرانے، انداز بیان پرانا، صرف مسائل بدل گئے ہیں۔ پھر مسائل کی تبدیلی کے باوجود لہجہ کی یکسانیت دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ حالی کی شعری حس میں کوئی کمی ہے یا شعر کی توانائی میں۔

بلاشبہ حالی کی غزل، قطعہ، مسدس، رُباعی اور مثنویوں میں جاندار چیزیں بھی ہیں۔ لیکن کوئی ایسی کمی بہرحال ہے جس کی وجہ سے ان کا شمار فن کاروں میں نہیں ہوتا۔ مولانا حالی نے عربی، فارسی اور خود اپنی زبان کے ادب کا مکمل مطالعہ کیا ہے۔ اُنہیں عیب و ہنر کا پرکھنے کا خداداد ملکہ حاصل ہے۔ وہ بہترین جوہری ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ خود اُن کا کلام گرمی، نشتریت اور جوش آفرینی سے خالی ہے۔

حالی کے یہاں نہ سودا کا زور ہے نہ میر کا جادو، نہ غالب کا لہجہ، نہ مومن کا بانکپن، نہ انیس کا کیف۔ قوم کا مرثیہ ضرور لکھا مگر رقت خیزی نہیں، افراد کی بے عملی ضرور بیان کی لیکن تحریک کی قوت کو نہیں چھیڑتے۔ حالات کی عکاسی ہے مگر نہ نظیر جیسی رنگینی و وارفتگی، نہ اکبر الہ آبادی کی طرح زہر خند۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ حالی قادر الکلام شاعر ہے۔ جدت پسند مزاج کا مالک ہے۔ دُنیا کے رنگ کو پہچانتا ہے، قوم کا عروج بھی دیکھ چکا

اور زوال کا عالم بھی سامنے تھا۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ انہوں نے انگریز کو قبول کر لیا ہو۔ انگریزی ادب و تہذیب دونوں کی برتری تسلیم کر لی ہے۔ چونکہ خود انگریزی نہیں جانتے، اس لئے انگریزی نظم کا مطالعہ کرکے نئی راہ نکالنے میں دقت محسوس کرتے ہیں اور وجدان پر بنا رکھ کر تقلید کے لئے چل کھڑے ہوئے ہے

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

قوم کا مزاج پختہ ہو چکا تھا۔ زبان کا خمیر تیار تھا۔ برصغیر کی اُردو مستقل حیثیت کی مالک تھی۔ ادیبوں کا مسلک معین تھا۔ عوام تباہیوں کا شکار تھے، وہ مشکلوں سے دوچار تھے۔ دل میں درد تھا مگر کراہنے کے سوا کچھ کرنے کی صلاحیت کھو چکے تھے۔ حالی شدتِ غم میں ان کے ساتھ ہو گئے۔ شاعر کی امتیازی خصوصیات چھوڑ کر وہ بھی عام غمخواروں کی طرح رونے لگے۔ ظاہر ہے کہ فقط غم، غم کا مداوا نہیں ہوا کرتا۔ غم زدہ اور غم خوار میں کوئی امتیاز تو ہونا چاہیئے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ شیفتہ کی صحبت نے ــــ جس کے اثرات کا مولانا کو اقرار تھا ـــــ اور سر سیّد کے طریقِ کار نے حالی کو دبا لیا ہو۔ ان کا شعری کارنامہ مسدّس حالی مانا گیا ہے۔ مسدس کا یہ عالم ہے کہ سر سیّد کہتے تھے:

"بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے
اعمالِ حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ
تُو کیا لایا؟ میں کہوں گا کہ حالی سے مسدّس لکھوا لایا ہوں،
اور کچھ نہیں۔"

نظم جدید کا آغاز، اصلاحِ نظم اُردو کی تحریک کا حرفِ اوّل تھا۔ مولانا حالی اس تحریک کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ حالی کی مستقل مزاجی نے اس تحریک میں قوت اور تاثیر پیدا کی۔ اُنہوں نے بڑے بڑے طوفانوں سے ٹکر لی، انتہائی سخت تصادم سے دوچار ہوئے مگر ساحل پر روشنی کا مینار قائم کرکے دم لیا۔ یہ مینار "مقدمۂ شعر و شاعری"

ہے —— لیکن ان کا نفسیاتی تاثر یہاں بھی انفعالی ہے، اپنی منظومات کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"۱۸۷۴ء میں مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائڈ کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا..... مجھ کو مغربی شاعری کے اصول سے نہ تو اس وقت کچھ آگاہی تھی اور نہ اب ہے۔ نیز میرے نزدیک مغربی شاعری کا پورا پورا تتبع ایک ایسی نامکمن زبان میں جیسی کہ اُردو ہے، ہو بھی نہیں سکتا۔ البتہ کچھ تو میری طبیعت مبالغہ سے اور اغراق سے بالطبع نفور تھی اور کچھ اس نئے چرچے نے اس نفرت کو زیادہ مستحکم کر دیا۔ اس بات کے سوا میرے کلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے انگریزی شاعری کا تتبع کیا جا سکے۔"

(صفحہ ۳، مجموعہ نظم حالی)

واقعیت پسندی، صاف گوئی، خلوص اور تشبیہ و استعارے کی رنگینیوں سے احتیاط حالی کا طرۂ امتیاز ہے۔ اُردو ادب میں حالی اس میدان کے شہسوار ہیں۔ ہر شخص ان کے اس خلوص پر فریفتہ ہے۔ لیکن یہ خلوص بھی ایک انفعال ہے۔ مولانا نے خود اپنے سوانح میں لکھا ہے کہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی صحبت میں شوق شعر و شاعری اُبھرا:

"درحقیقت مرزا کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوتا بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا، وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرتا اور سیدھی سادی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔"

حالی کی فنی زندگی کے تین موڑ ہیں۔ جوانی کی غزل گوئی، پختگی عمر میں لاہور کے مشاعروں میں نیچرل شاعری، بڑھاپے میں قومی شاعری۔ تینوں مرحلوں میں وہ کسی نہ کسی سایہ دار درخت

کے نیچے اپنی کھیتی لگاتے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نذیر احمد اور شبلی کی طرح اُن کا فنّی شعور دبا دبا نظر آتا ہے۔

جدید شاعری کے بانی ہونے کے باوجود انہیں جو مرتبہ ملنا چاہیئے تھا تاریخ ادب نے بحیثیت شاعر کے انہیں وہ درجہ نہیں دیا۔ حالانکہ وہ معاشرے کے ترجمان بھی ہیں اور زبان و بیان کے مصلح بھی، صاحب نظر نقاد بھی ہیں اور قوم کے بہی خواہ بھی۔

(۴)

حالی نے آزاد کے ساتھ جدید نظم نگاری اور نیچرل شاعری کا آغاز کیا لیکن انداز میں اُن سے الگ رہے۔ آزاد کے یہاں اہل زبان کا شعور، دلّی اور لکھنؤ کا اہتمام اظہار ہے۔ کلاسیکی قدروں کا احترام ہے۔ وہ نفسیاتی طور پر اپنی روایتوں کے معتقد تھے۔ حالی نفسیاتی لحاظ سے ان پابندیوں سے آزاد تھے۔ حالی نہ دلّی کے رہنے والے تھے نہ زبان و تہذیب دہلی کی قدروں کے ترجمان، ان کو بات کرنا آتی تھی۔ وہ مطلب سمجھنے سمجھانے کے قائل تھے۔ لہذا فطری سادگی کو پسند کرنے لگے۔ حالی متعدد وجوہ کی بنا پر اسپاٹ انداز بیان اختیار کرنے پر مجبور رہے۔ میرامن کی طرح دلّی کے روڑے کیونکر بن جاتے اور آزاد کی طرح اُردوئے معلّٰی کے پرستار کیسے ہو جاتے۔ انہیں امراء القیس اور لبید پسند رہے مگر اُسے نمونہ بنانا بے سُود جانتے ہیں۔ انہیں فردوسی کے بجائے سعدی کے مسائل پسند تھے۔ وہ اسی منزل تک جانا چاہتے تھے مگر شیرازیت کی ڈگر پر نہیں۔ سرسیّد کی راہ سے سادگی، آزادہ روی، مقصد پسندی، نتیجہ خیزی کے اصولوں پر ہو۔ وہ لکھنؤ اور دلّی کے دبستان کو اوپرے دل سے مانتے تو ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ خاص فلسفیانہ اصولوں کا فقدان بتاتے ہیں لہذا زبان کے اس معیار کو نظر انداز کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا مقدمہ آزاد کی تقریروں کے بیس برس بعد لکھا گیا۔ انہوں نے آب حیات کے عمل اور ردّ عمل کو دیکھنے کے بعد "مقدمہ" قلمبند کیا۔ اُردو شاعری کا مطالعہ آزاد کے نقطۂ نظر سے نہیں، مکالے کے زاویۂ فکر اور سرسیّد کے مقاصد سامنے رکھ کر کیا۔

حالی خالص نظریاتی آدمی تھے، قومی اصلاح، معاشرے کو غلط روی سے بچانا اُن کا مقصد تھا، اس لئے زبان و ادب کو بھی معاف نہ کرسکے۔ مقدمہ شعر و شاعری اصلاح زبان اور اصلاح شاعری کی بھرپور کوشش ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ مولانا کا لہجہ واعظانہ ہے۔ مثلاً

ہیں فصاحت میں مثل واعظ و حالی دونوں
دیکھنا یہ ہے کہ بے لاگ سخن کس کا ہے

مؤثر ہے بہت حالی ترا وعظ
کل اس کے سامنے بھی کچھ بیاں ہو

اسی وعظ کے نفسیاتی عوامل سے کبھی کبھی اُن پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، وہ یاس کی باتیں کرنے لگتے ہیں:

قوم کا حالی پنپنا ہے محال
تم نے رو رو سب کو رُلوایا عبث

یہی نہیں، مقدمہ میں تو ایک جگہ اُنہیں خود شعر کا وجود خطرہ میں نظر آیا ہے — متروکاتِ زبان پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اور زمانے کا اقتضا یہ ہے کہ وہ ہمیشہ بولے جائیں گے اور اگر نہ بولے جائیں گے تو تحریروں میں ضرور مستعمل رہیں گے شاید نثر میں بعض الفاظ کی ضرورت نہ پڑے لیکن شعر میں اُن کی ضرورت ہمیشہ رہے گی — (اگرچہ اس میں کلام ہے کہ شعر کی بھی ضرورت رہے گی یا نہیں) —"

(مقدمہ ص ۱۱۱، طبع اوّل)

دوسرے مقام پر ایک اور اہم بات کہہ گئے:

"غزل و تشبیب کی اُمنگ انفعال کے ساتھ بدل گئی اور جس شاعری پر ناز تھا، اس سے شرم آنے لگی، . . . .

. . . .

کچھ نظمیں قوم کی حالت پر لکھی گئیں۔ بعضوں نے پسند کیں
اور بعضوں نے ناپسند مگر چوٹ سب کے دل پر لگی۔ کہانی
بے مزا تھی مگر آپ بیتی اور باتیں اوپری تھیں مگر پتے کی۔"

(دیباچہ دیوان حالی)

یہ باتیں حالی کے ذہنی انفعال اور نفسیاتی تاثر کی نشاندہی کرتی ہیں۔ انفعال بہ شدت انتہائی نقصان دہ ثابت ہوئی۔ حالی عمر کے ساتھ خشک ہوتے گئے۔ شروع میں حسن بیان، لطافت اور شیرینی کا جو عالم ان کے کلام میں تھا۔ آخر میں بے نمکی، سپاٹ، اور بے لطف سادگی میں حد سے زیادہ بڑھ گیا۔ حالی فطری طور پر صاف گو ہیں۔ مگر یہ صفائی اتنی زیادہ ہے کہ اس میں فن کا شعور مجروح ہو جاتا ہے۔ شعریت کا خون ہو جاتا ہے۔ بات کھول کر بیان کرنا ہر جگہ مفید ہو سکتا ہے مگر شعر میں کنایہ ضروری ہے۔ آخر عرب ادیبوں نے یونہی تو نہیں کہا کہ ——— (اَلْکِنَایَۃُ اَبلغ مِنَ التَّصرِیحِ "— کنایہ صراحت سے زیادہ بلیغ چیز ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ شعر اچھے استعارے کا دوسرا نام ہے۔

حالی بات کا پھیلاؤ بھی بڑھاتے ہیں اور سادگی بھی اگر اس پھیلاؤ میں جزئیات کا شاعرانہ رُخ سے جائزہ لیتے اور خیال کی چاشنی دیتے جاتے تو کلام نکھر جاتا۔ "برکھارُت" میں اس قسم کی کیفیت ہے۔ بلاشبہ یہ مثنوی حالی کا بہت عمدہ شعری گلدستہ ہے۔

نیچرل شاعری ہو یا قومی شاعری، دونوں کے لئے جرأت مندی کی ضرورت تھی، نہ ہوتی تو کم از کم ٹکنیک اور مواد میں ندرت ہوتی۔ حالی کے یہاں جدید و قدیم میں مفاہمت کی جو دبی دبی سی حالت ہے، اُس نے دوسروں کے لئے راہ تو پیدا کی مگر خود منزل نہ بن سکی۔ بلاشبہ یہ راستہ پیدا کرنا بھی بہت بڑا کام ہے۔ نیچرل شاعری میں حالی نے عنوان بڑے اچھے تجویز کئے۔ بحریں بھی بہت موزوں انتخاب کیں۔ زبان بھی

سادہ رکھی۔ اسی وجہ سے ان کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسی بنا پر وہ بہت زیادہ توجہ کا مرکز بنے اور یہی ان کا رنگ مانا جاتا ہے۔

قومی شاعری کے لئے حالی محب وطن ہونے کی حیثیت سے عوام کا نام لیتے ہیں مگر ان کا مخاطب صرف مسلمان ہی رہتے ہیں۔ مسلمان سے خطاب کرتے وقت ماضی کے حوالے زیادہ دیتے ہیں۔ حال پر توجہ دلانے کے بجائے قنوطیت کے غلبہ سے دب کر صرف بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔ کوئی للکار نہیں، کوئی منصوبہ نہیں۔ کوئی پیشقدمی نہیں۔ اسلامی جذبہ ہے جو مسلسل اُبھرتا اور دبتا چلا جاتا ہے جیسے کوئی سیک رو آبجو جس میں ہلکی ہلکی لہریں آرہی ہوں۔ عبدالقادر سروری نے حالی کے مکمل فن پارے "مسدس" پر بڑا اچھا انتقادی جملہ لکھا ہے:

> "حالی کا مسدس مدوجزر انیس کی طرح مرثیہ نہ سہی مگر ایک قومی مرثیہ ضرور ہے۔ اس میں مربوط خیالی ضرور ہے لیکن واقعات کے ارتقا کی گنجائش نہیں۔"

(جدید اُردو شاعری ص ۲۷۰)

حالی کے تقریباً تمام نقاد حالی سے محبت بھی رکھتے ہیں اور ان کا ذاتی اور فنی احترام بھی کرتے ہیں مگر مجبوری کے ہاتھوں یہ باتیں کہنا پڑتی ہیں۔ یہ باتیں حالی کے عیوب نہیں بلکہ ان کے فن میں خلا کی نشان دہی کرتے ہیں۔ حقیقت میں حالی آپ بیتی کہتے ہیں۔ ان کی باتیں اوپری ہوں یا نہ ہوں ایک نہ ایک چیز کی اُن سے نشان دہی ضرور ہوتی ہے۔

حالی انقلابی نہ تھے کہ ہنگامہ برپا کر دیتے۔ وہ انتہا پسند بھی نہ تھے کہ سب کچھ ٹھکرا کر فخر کرتے۔ وہ میر کارواں ہوتے تو سفر کے آغاز سے خوش ہوتے۔ اُنہوں نے ایک آواز اُٹھائی۔ یہ آواز درد بھری آواز تھی۔ وہ قافلے کے ایک مسافر تھے جو دورانِ سفر گنگناتا چلا جا رہا ہو۔ وہ وقت کے ترجمان اور سرسید کے ہمخیال تھے۔ جدید تقاضوں کی صدا پر صدا دیتے جاتے تھے۔ یہی اُن کا طرۂ امتیاز ہے اور یہی اُن کا فن ہے۔

وہ دل ہے شگفتہ نہ وہ بازو ہیں توانا
پہنچا ہی بس اب کوچ کا تم سمجھو زمانا

خو مہرِ وطن سے ہے وداع اب کے سفر میں
جانا ہے وہاں پھر کے جہاں سے نہیں آنا

دلّی سے نکلتے ہی ہوا جینے سے جی سیر
گویا نہ رہا اب کہیں دُنیا میں ٹھکانا

یارب! طرب وصل ہو یا ہو وصل طرب
جس دن کہ یہ دونوں نہ ہوں وہ دن نہ دکھانا

دُنیا کی حقیقت نہیں جز حسرت و حرماں
چھل بَل میں تم اس زالِ فسونگر کی نہ آنا

افسوس، کہ غفلت میں کٹا عہدِ جوانی
تھا آبِ بقا گھر میں مگر ہم نے نہ جانا

یاروں کو ہمیں دیکھ کے عبرت نہیں ہوتی
اب واقعہ اپنا پڑا یاروں کو سُنانا

دُنیا میں اگر ہے بھی فراغت کا کوئی دن
وہ دن ہے کہ جس دن ہے اسے چھوڑ کے جانا

لی ہوش میں آنے کی جو ساقی سے اجازت
فرمایا: خبردار کہ نازک ہے زمانہ

ڈھارس سی کچھ اے ہمقدمو تم سے بندھی ہے
حالی کو کہیں راہ میں تم چھوڑ نہ جانا

(۵)

نفسیاتی تحلیل اور فنی مرتبہ معین کرنے کے بعد ہمیں مثنویات حالی پر گفتگو کرنا ہے۔ اِس بات چیت سے پہلے یہ بھی دیکھتے چلئے کہ حالی نے اور کس کس ہیئت کو آزمایا ہے۔ دیوان اور دوسرے مجموعوں کو سرسری طور پر دیکھئے تو اس میں قصیدہ بھی ہے اور غزل بھی، قصیدہ کم اور غزل زیادہ۔ قصیدے عام طور پر روایتی اسلوب سے خالی ہیں۔ ہاں نعتیہ قصیدہ بہت عمدہ ہے:

میں بھی ہوں حُسنِ طبع پر مغرُور
مجھ سے اُٹھیں گے اُن کے ناز ضرُور

غزلوں میں اچھی اچھی غزلیں اور بہت عمدہ عمدہ اشعار ہیں۔ حالی نے غزل کو ایک مزاج دیا ہے۔ اُنہیں غزل کہنا آتی ہے۔ وہ اپنی پابندیوں کی رعایت کے باوجود کامیاب غزل گو ہیں۔ ان کی مشہور غزلیں تو سب ہی کو یاد ہیں۔ ذرا دو ایک غیر مشہور شعر ملاحظہ ہوں ؎

آزما بھی دو خلشِ آرزوئے قتل
کیا اعتبار زندگیِ مستعار کا

رات کو بات بات پر سو سو دیتے جواب
مجھ کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا

بے وفا کونسی خوبی ہے نہیں جو تجھ میں
وصف اتنے ہیں جہاں، ایک وفا اور سہی

کہہ دو کوئی ساقی سے کہ ہم مرتے ہیں پیاسے
گر مے نہیں، دے زہر ہی کا جام بلا سے

عشق سنتے تھے جسے ہم، وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

رُباعی میں حالی کی شہرت مسلّم ہے۔ رباعیات حالی میں بڑی پختگی اور تیکھا پن ہے۔ غزل کی سادگی رباعیوں میں بھی ہے۔ مگر کچھ طنز اور مزاح کا رنگ بھی ملتا ہے۔ حالی نے یہ رنگ اپنی خشک صفائی کے لئے مداوا سمجھ لیا تھا۔ طنز تو خیر اُن کی طبیعت کو راس نہ آیا مگر مزاح اچھا خاصا نکھرا۔ مثلاً ۔ قرض سے کر حج کو جانے کی ضرورت"۔۔۔ سید احمد خاں کی تکفیر۔ وغیرہ۔

ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے "حالی کی قطعہ نگاری" پر بحث کرتے ہوئے بڑی معقول اور مضبوط رائے دی ہے :

" حالی کی رُباعیات اُن کے قطعات سے زیادہ مؤثر ہیں مگر قطعہ نگاری میں بھی وہ اصول شناس ثابت ہوتے ہیں۔ ان کے قطعات واقعہ و مکالمہ کی بنیاد پر کھڑے ہیں اور ان میں مطائبہ کا رنگ بھی پایا جاتا ہے مگر ان کے طنز میں چونکہ عموی طور پر ملامت پائی جاتی ہے، اس لئے طویل بیان کے بعد مدعم طنزیہ بیان نرم پڑ جاتا ہے جہاں ایسا نہیں ہوتا اور طنزیہ بیان میں تیکھا پن ہے۔ مثلاً " دلی کی شاعری کا تنزل"۔ وہاں قطعہ خوب چست بیٹھا ہے۔"

(نقوش ص ۲۳۲، اگست ۶۰ء)

" کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان ' قطعات میں۔ اسی لئے مکمل ترین قطعہ ہے کہ اس میں نہ طول ہے نہ وعظ، نہ مکالمہ ہے نہ اخلاقی درس ہے۔ دل کی صدا ہے

اور انگریز کے خلاف دبے جذبات کا اُبھار۔ لہٰذا پورا قطعہ سڈول نظر آتا ہے۔ خوبصورتی کے ساتھ بڑا جوش ہے۔ تمسخر آمیز طنز کی ایسی مثالیں دیوان میں کم ہیں لیکن ایک دو مثالیں بھی حالی کو اعلیٰ درجہ کا شاعر ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں —— گیارہ شعر ہیں مگر ایک شعر بھی زائد نہیں۔

دو ملازم، ایک کالا اور گورا دوسرا
دوسرا پیدل، مگر پہلا سوار رہوار
تھے سول سرجن کی کوٹھی کی طرف دونوں رواں
کیونکہ بیماری کی رخصت کے تھے دونوں خواستگار
راہ میں دونوں کے باہم ہو گئی کچھ مشت مشت
کوکھ میں کالے کی اک مکا دیا گورے نے مار
صدمہ پہنچا جس سے تلی کو بہت مسکین کی
آ کے گھوڑے سے لیا سائیس نے اس کو اتار
کھڑک کر کالے کو گورے نے تو اپنی راہ لی
چوٹ کے صدمے سے غش کالے کو آیا چند بار
آخرش کوٹھی پہ پہنچے جا کے دونوں پیش و پس
ضارب اپنے پاؤں سے مضروب ڈولی میں سوار
ڈاکٹر نے آ کے دونوں کی سنی جب سرگذشت
تہ کو پہنچا سخن کی سن کے قصہ ایک بار
دی سند گورے کو لکھ، تھی جس میں تصدیق مرض
اور یہ لکھا تھا سائل ہے بہت زار و نزار
یعنی اک کالا، نہ جس گورے کے مکے سے مرے
کر نہیں سکتا حکومت ہند پر وہ زینہار

اور کالے سے تم کو مل نہیں سکتی سند
کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جان دار
ایک کالا پٹ کے جو گر رسے ہی فوراً مر نہ جائے
آئے بابا، اس کی بیماری کا کیونکر اعتبار

اشعار کی ترتیب کی عمدگی ہے یا قطعہ کے مجموعی تاثر کا نتیجہ کہ پڑھنے والا طنز و مزاح بلکہ سیاسی چوٹ محسوس کرتا ہے۔ حالی کا عروج فن یہیں تک پہنچ سکتا تھا اور بس۔
حالی کے قطعات میرے خیال میں اس لحاظ سے بھی بہت ہی اہم ہیں کہ اُن کی بدولت ہماری شاعری میں اس ہیئت کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی۔ اسمٰعیل میرٹھی، نذیر احمد، شبلی، پھر اقبال اور جوش نے اسی ہیئت کو فنی عظمت بخشی۔ دیوان حالی اور دوسرے مجموعوں میں ان کے بعض اہم قطعات ایسے بھی ہیں جن میں بڑی توانائی اور زندگی ہے۔ بہاولپور کے ایک جلسے کے لیے انجمن گدایان قوم (پنجاب) کی طرف سے قطعہ لکھا ہے:

ڈھونڈتے خضر مبارک کو یہاں آئے ہیں ہم!
تیرہ ظلمت کر بھٹکا ہوا اک کارواں آئے ہیں ہم
ڈرہے ہو خوش دل ہیں وہ سنکر نہ ہوں پژمردہ دل
سخت عبرت خیز لیکر داستاں آئے ہیں ہم
ہند میں اسلام کا پھولا پھلا تھا جو چمن
دیکھے اُس کا مژدۂ فصل خزاں آئے ہیں ہم
علم جو زندہ کیا تھا آپ کے اجداد نے
آج اس در پہ اسی کے نوحہ خواں آئے ہیں ہم
قوم کھو بیٹھی ہے جو عباسیوں کی یادگار
جستجو میں اس کی مشعل لیکے یاں آئے ہیں ہم

تاکہ ہو معلوم سب کو قوم کی حالت ہے کیا
اس لئے ڈالے گلے میں جھولیاں آئے ہیں ہم
خود غرض ٹھہرائیں یا مکار ہم کو یا گدا !
ذلتیں یہ کرکے سب خاطر نشاں آئے ہیں ہم
ہے بنی ہاشم کی مہماں پروری ضرب المثل
اس لئے یاں بن بُلائے میہماں آئے ہیں ہم
تشنگی اپنی بجھانی ہو گی اسے آب حیات
لیکے منہ میں قوم کی سوکھی زباں آئے ہیں ہم

حالی نے قطعات[1] کو مستقل فن نہیں بنایا۔ ورنہ ممکن تھا کہ رُباعی کی طرح اُن کے قطعات بھی مقبول خاص و عام ہوتے۔ قطعہ نگاری ان کا مستقل فن نہیں، بظاہر وہ طول پسند تھے قطعہ کی زمین طول کی گنجائش نہیں رکھتی۔ لہٰذا وہ مثنوی اور مسدّس کی طرف مائل ہو گئے۔

مسدّس | اُردو شاعری میں مرثیہ کی وسعتوں نے مسدّس کی ہیئت کو بہت اہمیت عطا کی۔ نئی تحریک کے وقت یہ سوال اُبھرا تھا کہ مسلّمہ شعری ہیئتوں میں کس ہیئت کو اپنایا جائے آزاد اور حالی دونوں انگریزی کے عالم نہ تھے، اُردو شاعری کا مزاج ابھی تک کسی مغربی ٹکنیک کی متحمل بھی نہیں۔ مسدّس یعنی مراثی، خصوصاً انیس کے مرثیے مقبولیت کی معراج تک پہنچ چکے تھے، اس لئے حالی نے بھی اس ہیئت کو اپنایا۔

۱۔ ننگ خدمت

---

[1] تاریخی قطعات تعداد میں اُنیس بیس ہیں۔ اکثر تاریخیں بڑی صاف اور اکثر مصرعے بڑے برجستہ ہیں۔ مثلاً

۱۔ غیب سے آئی صدا ، خلد میں ناصر وزیر (۱۲۹۸ھ)
۲۔ کہو اس کو جغرافیہ بے مثال (۱۸۸۲ء)
۳۔ دربار قیصری کا مرقع ہے چھپا خوب (”)
۴۔ کرد تعمیر کعبہ ابراہیم (۱۳۰۰ھ)

۲۔ شکریہ سرجیمس لائل

۳۔ مرثیہ محمود خاں

۴۔ مدّ و جزر

چار اہم مسدس حالی سے یادگار ہیں۔ گویا حالی کے نزدیک مسدس اُن کے ذہنی افتاد سے جوڑ نہیں کھاتے۔ حالی مکالمہ اور خطاب، تقریر اور بیان کا اسلوب چاہتے تھے۔ اُن کی پہلی نظر مثنوی پر پڑی اور مدتوں یہی ہیئت ان کے تجربے میں رہی۔ بلاشبہ مثنوی اُن کے مطلب کی چیز تھی۔ حالی نے مثنوی اور مثنوی نے حالی کو اچھی خاصی شہرت بخشی مگر مولانا کی شاعری نے مسدس کے شہ پروں سے پرواز پائی۔

مسدس مد و جزر مدتوں سے نقد و نظر کا نشانہ ہے، سرسید نے تہذیب الاخلاق میں چھاپا اور اودھ پنچ نے اس پر خوب لے دے کی۔ معاصرین میں بعض بڑوں نے بھی احتساب کیا۔ لیکن کم و بیش بیس پچیس سال تک بعض حلقوں میں مسدس کا گویا ورد ہوتا ہوتا رہا۔ آج موافقت و مخالفت کے بادل چھٹ چکے ہیں۔ مدّ و جزر اسلام شہرت کے بام عروج پر پہنچ کر طاقِ نسیاں کی نذر ہوتا جا رہا ہے —— کیوں؟

حالی سیاست و ثقافت کی گہرائی میں جا کر نہیں دیکھتے، دوسروں پر بھروسہ ہے فضا کی آوازوں پر کان لگے ہیں۔ جو سب نے کہا، حالی نے اُسے "فعولن فعولن فعولن" کے حسین قالب میں ڈھال دیا۔ اُنہیں سرسید کے مسلک سے سو فی صد اتفاق تھا — انگریزوں کے علوم و ثقافت کی چکا چوند اُنہیں بہت پسند تھی۔ شیفتہ کی صحبت اور طبیعت کی اُفتاد خالص مذہبی تھی۔ مسدس میں طبیعت کے اس رجحان نے بہت اثر ڈالا۔ مسدس کی والہانہ کیفیت جو پسند عام کا سبب ہے وہ اسی کیفیت کا نتیجہ ہے، ورنہ نئی روشنی اور "نیچر" کے رجحانات سے حالی کا تاثر حقیقت سے زیادہ عقیدت پر مبنی ہے۔ غالب کے بقول:

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے

غالب اس کش مکش میں حوصلۂ بے مثال رکھتا ہے ؎

ہے موجزن اِک قلزم خوں' کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

حالی "قلزم خون" کے بجائے پامالی دیکھتے ہیں۔ پامالی بھی ایسی جس کے رد تق کا امکان بہت کم نظر آتا ہے۔

غرض عیب کیجے بیاں اپنے کیا کیا
کہ بگڑا ہوا یاں ہے آوے کا آوا
فقیہ اور جاہل' ضعیف اور توانا
تاسّف کے قابل ہے احوال سب کا

مریض ایسے مایوس دنیا میں کم ہیں
بگڑ کر کبھی جو نہ سنبھلیں وہ ہم ہیں

"ننگ خلق" نامی مثنوی میں بھی یہی رنگ ہے۔ بیان کے اسی یک رُخے پن کو دیکھ کر ملک چیخ اُٹھا تھا۔ مولانا نے اسی خلا کو پُر کرنے اور کمی کو دُور کرنے کے لئے ضمیمہ لکھا۔

دراصل خواجہ صاحب سبک رفتار مسافر ہیں۔ قافلہ سالار بننے سے ہچکچاتے ہیں۔ سامنے نہیں آتے۔ کھُل کر بات نہیں کرتے۔ چھوٹوں کو ڈانٹنے، بڑوں کا بازو تھامنے برابر والوں کو مہمیز دینے میں اُنہیں تکلف ہے۔ یہی تکلف انہیں طرح طرح کی کسوٹیوں پر کسنے سے روکتا ہے۔ مولانا نے ترکیب بند بھی لکھے۔ ہم نے اس خیال سے پڑھا کہ شاید اس ہیئت میں ان کا تیور بدلے مگر مولانا کی شخصیت ان کے ظاہر و باطن سے عبارت ہے۔ اُن کا ظاہر و باطن یکساں ہے۔ صابر، مستقل مزاج، ترقی سے دلچسپی نہ رکھنے والے، ٹکڑے پر قناعت کرنے والے، سرسیّد کی طرف بُلانے والے، نئی راہوں کی طرف اشارہ کرنے والے۔

مرثیہ : حالی کا رنگ، غالب اور حکیم محمود خاں کے مرثیوں میں نکھرا ہے، وہ

دوستوں کے غم میں اشک فشانی کر سکتے تھے۔ دونوں مرنے والے حالی کے خیال میں تباہ حال قوم کے نشان امتیاز سمجھے جاتے تھے۔ اُن کے انتقال سے حالی چیخ اُٹھے۔ یہی چیخ اور درد کی فراوانی مرثیوں کی جان ہے۔ منظومات حالی کا بیشتر حصّہ یُوں تو نوحہ ماتم ہے:

اب سُنو حالی کے نوحے عمر بھر
ہو چکا ہنگامہ مدح و غزل

رونے میں تیرے حالی لذّت ہے کچھ نرالی
یہ خوں فشانیاں ہیں یا گل فشانیاں ہیں

خواجہ امداد حسین مرحوم کے لئے مولانا حالی کا مرثیہ یادگار مرثیہ ہے۔ خواجہ صاحب مولانا کے بڑے بھائی بھی تھے اور مربّی و سرپرست بھی۔

جس بھائی نے بیٹوں کی طرح بھائی کو پالا
سُوکھی ہوئی کھیتی میں دیا باپ کی پانی
جیتا بھی رہا بھائی گر اس بھائی کے پیچھے
لذّت نہیں جینے سے نصیب اس کو اٹھانی

قطعات و مسدس و ترکیب بند، غزل اور مثنوی کا مجموعی مطالعہ حالی کی پختگی و مہارت ثابت کرتا ہے۔ ایک ہی انداز ہے جو ہر رنگ میں نظر آتا ہے ــــ دیباچہ دیوان میں مولانا نے اپنے کلام کی ہیئت و مواد کے بارے میں لکھا ہے:

"بے شک طرز ادا میں جیسا کہ ابھی بیان ہو چکا وہ بہت کم فرق پائیں گے۔ مگر خیالات میں ذرا بھی غور فرمائیں گے تو اُن کو ایک دوسرا عالم نظر آئے گا۔ وہ دیکھیں گے کہ گو محمل نہیں بدلے مگر محمل نشین بدل گئے ہیں اور گو پیالے وہی ہیں مگر شراب اور ہے۔

نئے خیالات سے ایسے خیالات ہرگز مراد نہیں ہیں جو

کسی کے ذہن میں نہ گزرے ہوں یا کسی کے ذہن کی اُن تک
رسائی نہ ہو سکے بلکہ ایسے خیالات مراد ہیں جو شاعر و ناشاعر
کے دل میں ہمیشہ گزرتے ہیں اور ہر وقت اُن کے پیشِ نظر
ہیں۔"

اسی وجہ سے کسی نے خوب کہا ہے ۔۔ حالی اور قاری کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے ۔۔ حالی، قاری و سامع سے اتنا قریب ہیں کہ ان کی بات سُن کر تعجب یا غیر معمولی تاثر نہیں ہوتا۔ ہمارے خیال ہمارے ہی لفظوں میں ادا ہو جاتا۔ لہٰذا وہ بات نہیں پیدا ہوتی جس کی شاعر سے توقع ہوتی ہے۔ یہ بات پیدا کرنے کے لئے لذّت تقریر درکار ہے ۔۔۔ غالب نے اس رشتے کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس انداز پر بڑا عمدہ تنقیدی شعر کہا ہے:

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

یعنی دل کی بات اُچک لینا۔ دوسرے مصرے کا تصوّر اس انداز میں بیان کرنا چاہیئے کہ سننے والا دل تھام لے مگر حالی اس مشورے پر عمل نہیں کرتے، اُن کے نزدیک عام خیالات کو عام انداز اور عام زبان میں ادا کرنا ہنر ہے۔ بلاشبہ یہی مولانا کا فن ہے۔

مثنوی:

لاہور میں نیچرل شاعری کا پہلا مشاعرہ مئی ۱۸۷۴ء میں ہوا۔ اس وقت حالی کی عمر سینتیس برس تھی۔ اس سن و سال میں جوانی کے آثار میں بڑا اعتدال پیدا ہو جاتا ہے۔ تجربوں کا آغاز ہوتا ہے۔ بات سمجھنے اور بات کرنے کا ڈھب آ جاتا ہے۔ شاعر اس عمر میں بھرپور فنی مظاہرے کر سکتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے سترہ سال بعد برصغیر کے حالات بالکل بدل چکے تھے۔ انگریزوں کی مستقل حکومت معرضِ وجود میں آ چکی تھی۔ سرکاری ادارے اپنے مقاصد میں کامیابیاں حاصل کر رہے تھے جو لوگ ہنگامہ ۵۷ء میں تعلیم یافتہ تھے۔ وہ نئے نظام کے حامی

اور پُرانے نظام کی اصلاح چاہتے تھے۔ "نئے پُرانے" کی بحث جہاں رہن سہن، میل جول، شادی بیاہ، تعلیم و تربیت میں تھی، وہاں شاعری کے موضوع پر بھی ہوتی تھی۔

لاہور کا ماحول، یہاں کے باشندے، یہاں کے علمی اور سیاسی حالات دہلی سے بالکل مختلف تھے۔ حالی اس شہر میں اجنبی ہونے کی بنا پر زیادہ محترم تھے۔ جذباتی لحاظ سے فراقِ وطن نے انہیں بہت سی یادوں میں ڈبو رکھا ہوگا۔ اِس پس منظر میں مولانا حالی نے "برکھارُت" لکھی:

گرمی کی تپش بجھانے والی — سردی کا پیام لانے والی
قدرت کے عجائبات کی کان — عارف کے لئے کتاب عرفان
وہ شاخ و درخت کی جوانی — وہ مور و ملخ کی زندگانی!
وہ سارے برس کی جان برسات — وہ کون خدا کی شان برسات
تھیں لومڑیاں زبان نکالے — اور لُو سے ہرن ہوئے تھے کالے

براہ راست بات شروع کرنے کا یہ انداز مولانا کے نزدیک نیچرل شاعری کے نظریہ کا عملی مظاہرہ اور واقعاتی سادگی بڑی پُرکاری لئے ہوئے ہے۔ پوری مثنوی حسن کا مجسّمہ ہے۔ حالی کی سادگی کا جوہر اس وقت کُھلتا ہے جب آزاد کی مثنوی "ابرِ کرم" بھی سامنے ہو۔ آزاد نے باقاعدہ شاعرانہ اہتمام کیا ہے۔ ان کے الفاظ کی دروبست، خیالات کا تدریجی ارتقا، کا مطالعہ کیا جائے:

جو نکتہ یاب ہیں ورق انقلاب کے — دن رات کو سمجھتے ورق ہیں کتاب کے
دفتر ہے اُن کے سامنے ماضی و حال کا — جو آگے آئینہ ہے دکھاتا مثال کا
شاہانِ ماسلف کے مرقعے عجیب ہیں — روشن سب اس میں عہد بعید و قریب ہیں
تحریر تازہ لاتی ہے تقدیر سامنے — آتی ہے دمبدم نئی تصویر سامنے
اِس کشورِ فنا کا عجب طرز و طور ہے — دم بھر میں صورت اور ہے دم بھر میں اور ہے
قانون انقلاب یہاں رسم و راہ ہے — موسم نہ موسم اس میں نیا بادشاہ ہے
اب یاں جو چند روز سے قانون عام ہے — گرمی کے بادشاہ کا گرم انتظام ہے

عالم تھا شعلہ خیز و فلک شعلہ ریز تھا | اِک حکم تھا جو گرم تو اک حکم تیز تھا
منہ پر زمین کے دیکھو تو ہے خاک اُڑ رہی | اور گرد چار سُو تہِ افلاک اُڑ رہی
دنیا میں بُوند بُوند کو خلقت ترس رہی | پانی کی جائے آگ فلک سے برس رہی
شہروں میں سُوکھ سُوکھ کے جنگل چمن ہوئے | اور جنگلوں میں دھوپ سے کالے ہرن ہوئے

چھ شعروں کے بعد ہے:

اے ابر آکر تو تو شہرِ تشنگاں ہے | جو خشک و تر ہے تیرے کرم سے نہال ہے
تیرے عمل کے واسطے رنگِ جہاں ہے اور | تیری زمیں ہے اور ترا آسماں ہے اور

وہی نظریہ کا فرق، آزاد نگینے جڑتے اور سونے پر کندن کا کام کرتے ہیں، پھر اس پر خیالات کی جلا کرتے ہیں، ان کے یہاں نسبت کاری ہے، مرصع سازی ہے۔ حالی کے یہاں سادگی، مبالغہ سے پرہیز، تشبیہ و استعارے میں احتیاط ہے آزاد اپنے اِسی رنگ میں لالہ زار، مرغزار، زمین و آسمان، صحرا، کھیتیاں، مشرق و مغرب، جنگل پہاڑ کا حال لکھتے چلے جاتے ہیں۔

حالی نے ۱۴۵ شعر لکھے ہیں مگر نہ آسمان کا نقشہ ہے نہ بارش کی تصویر۔ صرف آنکھوں کے سامنے چلتے پھرتے زمینی مشاہدات کا سادہ سا بیان ہے۔ زمین بھی لاہور کی زمین اور مشاہدات بھی لاہور کے مشاہدات:

لاہور میں شب ہوئی تھی لیکن | کشمیر میں پہنچے جب ہوا دن
رات سے ہوا میں بھر دیا کچھ | اک رات میں کچھ سے کر دیا کچھ

آپ نے ملاحظہ کیا — ایک تشبیہ لاتے مگر فوراً اُسے کھول دیا، دوسرے شعر میں لاہور کو کشمیر کہنے کی وجہ بیان کر دی۔ غنیمت ہوتا کہ پہلے مصرع میں جو کہا تھا دوسرے میں اسے مبہم رہنے دیتے — نہیں " ایک رات میں کچھ سے کر دیا کچھ" کہے بغیر مولانا کے نزدیک نظریہ پر زد پڑتی تھی۔

اسی انداز کے شعر کہتے کہتے ایک موڑ پر انتہائی حسین ٹکڑا لکھ دیا:

کھم باغوں میں جا بجا گڑے ہیں | جھولے ہیں کہ سُولسو پڑے ہیں

کچھ لڑکیاں بالیاں ہیں کم سن ‏‏ جس کے ہیں یہ کھیل کود کے دن
ہیں پھول رہی خوشی سے ساری ‏‏ اور جھول رہی ہیں باری باری
جب گیت ہیں سارے مل کے گاتی ‏‏ جنگل کو ہیں سر یہ وہ اُٹھاتی
اِک سب کو کھڑی جھلا رہی ہے ‏‏ اِک گرنے سے خوف کھا رہی ہے

مجھے یہ اشعار پڑھتے پڑھتے حالی کا وہ بیان یاد آتا ہے جہاں وہ نیچرل شاعری کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

کوئی رکھ کے زیر زنخداں چھڑی ‏‏ رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی
رہی کوئی انگلی کو دانتوں میں داب ‏‏ کسی نے کہا: گھر ہوا یہ خراب

"ان دونوں شعروں کو نیچرل کہا جائے گا۔ کیونکہ بیان بول چال کے موافق ہے۔ اور مضمون بھی ایسا ہے کہ جس موقع پر وہ لایا گیا ہے وہاں ہمیشہ ایسا ہی واقع ہوا کرتا ہے"۔۔۔ (مقدمہ طبع اوّل ص ۹۲)

فرق یہ ہے کہ میر حسن "رہی نرگس آسا کھڑی کی کھڑی" کہتے ہیں، حالی کو اس میں تکلف ہے وہ جھولا جھولنے والیوں کے بیان میں آٹھ شعر لکھنے کے باوجود کوئی تشبیہ استعارہ نہیں لاتے۔ اس کے باوجود ان کے دبے دبے جذبات، جوانی کا سرور ابھرتا اور شعروں میں مستی بھر دیتا ہے۔ انہیں خود معلوم ہو یا نہ ہو۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا رنگ بدل رہا ہے، وہ ندی نالوں کی طرح بہنا شروع کرتے ہیں۔

اک جھولے سے وہ گری ہے جا کر ‏‏ سب ہنستی ہیں قہقہے لگا کر
گھڑ ناؤ پہ ہے سوار کوئی ‏‏ اور تیر کے پہنچا پار کوئی

سات شعروں میں ندیوں کا حال، کشتیوں کا ذکر کر کے کہتے ہیں:

بیزار اک اپنے جان و تن سے ‏‏ بچھڑا ہوا صحبت وطن سے
دیکھے کوئی اس گھڑی کا عالم ‏‏ وہ آنسوؤں کی جھڑی کا عالم
وہ آپ ہی آپ گنگنانا ‏‏ اور جوش میں آکر کبھی یہ گانا

اے چشمۂ آب زندگانی   گھٹیو نہ کبھی تری روانی
جاتی ہے جدھر تری سواری   بستی ہے اسی طرف ہماری

اور حالیؔ پھوٹ بہے — اپنی سبھا کو یاد کرتے ہیں، کسی کو سلام و پیام بھجواتے ہیں اور کہتے ہیں :

جب سبزہ و گل ہیں لہلہاتے   صحبت کے مزے ہیں یاد آتے
ہم تم یونہی ہاتھ میں دئے ہات   پھرتے تھے ہوائیں کھاتے دن رات
جب پیڑ سے آم ہے ٹپکتا   میں تم کو اِدھر اُدھر ہوں تکتا
تم میں جو ہے بزمِ تن پہ پڑتی   چنگاری سی ہے بدن پہ پڑتی
پردیس میں سچ ہے کیا ہو جی شاد   جب جی میں بھری دیس کی یاد
نشتر کی طرح تھی دل میں چبھتی   فریاد یہ دردناک اس کی
حیرت رہی دیر تک کہ آخر   رو رہا ہے کہاں کا یہ مسافر
پھر غور سے اک نظر جو ڈالی   نکلا وہ ہمارا دوست حالی

کس قدر رس ہے، کیا دل کشی ہے، جذبات میں خلوص و راستی ہے۔ بیان میں صفائی بھی ہے اور وضاحت بھی شعروں کی روانی ایسی ہے جیسے آبشار بلندی سے گرتا ہے اور دامن میں پھیلتا جاتا ہے۔ ترنم ہے، درد ہے، لذت آفرینی ہے۔ مثنوی برکھارت اپنی خصوصیات کی وجہ سے ایک مکمل منظومہ ہے۔

نشاطِ اُمید — حبِ وطن — کا رنگ ڈھنگ یہی ہے۔ وہی سادگی، وہی حُسن وہی نکھار — وہی دلکشی، وہی تاثیر ہے۔ فرق یہ ہے کہ "برکھارت" میں فراق احباب اور لڑکیوں بالیوں کا ذکر ہے، حُسن میں جنس کا ذکر ہے، عشق کی کسک ہے، نشاطِ اُمید میں ماضی بعید کی مقدس تاریخ کے حوالے ہیں :

نوحؑ کی کشتی کا سہارا تو ہے   چاہ میں یوسفؑ کی دلآرا تو ہے
رام کے ہمراہ چڑھی رن میں تو   پانڈوں کے بھی ساتھ پھری بن میں تو

عشق کی کہانیوں کا حوالہ ہے اور بالکل سرسری طریقے سے :

ہو گیا فرہاد کا قصہ تمام
پر ترے فقروں پہ رہا خوش مدام

تُو نے ہی رانجھے کی یہ بندھوائی آس
ہیر کی فرقت میں بھی گویا کہ پاس

حبِ وطن ـــــ میں خطیبانہ رنگ آگیا۔ وہی مولویانہ انداز، وہی عام اسلوب، ملتاجلتا اسلوب جو خواجہ صاحب کے پُورے دفترِ شعر کا خلاصہ ہے :

اے سپہرِ بریں کے سیّارو!
اے فضائے زمیں کے گلزارو!

اے پہاڑوں کی دلفریب فضا
اے لبِ جُو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا

اے عنادل کے نغمۂ سحری
اے شبِ ماہتاب تاروں بھری

دہلی کی دُوری نے تڑپایا اور یادِ احباب نے شعروں کی صورت اختیار کی، اسی تڑپ نے اشعار میں گرمی پیدا کر دی :

اے وطن اے مرے بہشتِ بریں
کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں

رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا
وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

تیری دُوری ہے مورِدِ آلام
تیرے چُھٹنے سے چُھٹ گیا آرام

کاٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے
گل ہیں نظروں میں داغ بن تیرے

جو کہ رہتے ہیں تجھ سے دُور سدا
اُن کو کیا ہوگا زندگی کا مزا

ہو گیا یاں تو دو ہی دن میں یہ حال
تجھ بن اک ایک پل ہے ایک اک سال

سچ بتا تُو سبھی کو بھاتا ہے،
یا کہ مجھ سے ہی تیرا ناتا ہے

کیا زمانے کو تُو عزیز نہیں؟
اے وطن! تُو تو ایسی چیز نہیں

اس کے بعد تاریخ کے حوالے دیتے ہیں :

حملہ جب قوم آریا نے کیا
اور بجا ان کا ہند میں ڈنکا

ملک والے بہت سے کام آتے
جو بچے وہ غلام کہلائے

گو غلامی کا لگ گیا دھبّہ
نہ چُھٹا اُن سے دیس پر اپنا

حضرت یوسف علیہ السلام کا حوالہ دے کر اصلاحِ خیالات اور دعوتِ عمل کی طرف گریز

کی ہے، اہلِ وطن کو للکارا ہے۔ باہمی تعاون، ذاتی ترقی اور وطن کی ناموری کا جذبہ بیدار کیا ہے :

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو! اُٹھو، اہلِ وطن کے دوست بنو
جب کوئی زندگی کا لطف اُٹھاؤ دل کو دُکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ
پہنو جب کوئی عمدہ تم پوشاک کرو دامن سے تا گریباں چاک
کھاؤ تو پہلے لو خبر اُن کی جن پہ بپتا ہے نیستی کی پڑی
پہنو تو پہلے بھائیوں کو پہناؤ کہ ہے اُترن تمہاری جن کا بناؤ

بھوکے، پیٹ بھرے، اہلِ مال اور اہلِ کمال کا حال کہتے ہوئے للکارتے ہیں :

سُنتے ہو سامعینِ با تمکین سُنتے ہو حاضرینِ صدر نشین
علم کو کر دو کو بہ کو ارزاں ہند کو کر دکھاؤ انگلستاں

اور آخر میں فرماتے ہیں :

اب نہ سیّد کا افتخار صحیح نہ برہمن کو شُدر پر ترجیح
ہوئی تُرکی تمام خانوں کی کٹ گئی جڑ سے خاندانوں کی
قوم کی عزّت اب ہنر سے ہے علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے
کوئی دن میں وہ دَور آئے گا بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا
نہ رہیں گے سدا یہی دن رات یاد رکھنا ہماری آج کی بات
گر نہیں سُنتے قول حالی کا پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

پُوری مثنوی بچّوں کے پڑھنے پڑھانے کے لائق ہے۔ نوعمروں کے دلوں میں یہ رس بھرے شعر اُترتے جاتے ہیں، وہ گنگنانے لگتے ہیں، پختہ شعور اور تنقید نگار کی نظر میں یہ اشعار حالی کے دل کی پکار اور مخلصانہ جذبات کا اظہار ہیں۔ ایک تقریر ہے جو بڑی پُر تاثیر ہے۔

آزاد کے یہاں انفعال اور احساسِ شکست کے بجائے ایک ہمہمہ، جوش اور اُبھار بن کر سامنے آتا ہے۔ اُن کا لب و لہجہ خطیبانہ نہیں، شاعرانہ ہے۔ حالی کا ابتدائیہ

پُرلطف ہے، آزاد کی مثنوی کے آغاز میں وہ آہنگ نہیں مگر تدریجی ترقی غضب کی ہے:

(۱)

ہے قول جملہ تجربہ کارانِ فارسی
اور کہتے ہیں یہ نظم نگارانِ فارسی

حبِ وطن ز ملکِ سلیماں نکوترست
خارِ وطن ز سنبل و ریحاں نکوترست

سلطانِ دل کا گرچہ یہی حکم عام ہے
اور متفق اسی پہ زمانہ تمام ہے

پر ملکِ مصلحت کا ہے کچھ انتظام اور
اس سلطنت کو چاہیئے طرزِ نظام اور

حبِ وطن اسے نہیں کہتے کہ باغ سے
نکلے جو گل تو خاک ہو فرقت کے داغ سے

(۲)

اے دوست! یہ تو دوستیِ سنگ و خشت ہے
یہ دوستی تو خوب نہیں بلکہ زشت ہے

آیا یہ دھیان آج جو وقتِ سحر مجھے
اک نقل یاد آ گئی اس اصل پر مجھے

دِلّی کہ جو ہمیشہ سے کانِ کمال ہے
جو باکمال اس میں ہے وہ بے مثال ہے

اک شخص واں ستارنوازی کی جان تھا
پر جان سے عزیز تھا دِلّی کو جانتا

آیا دکن سے خلعتِ زر اس کے واسطے
اور نقد بہرِ زادِ سفر اس کے واسطے

ستار نواز کی تیاریِ سفر، روانگی اور دلّی سے نکل کر راج گھاٹ پر جانا اور وہاں سے یہ کہہ کر لوٹ آنا:

جمنا نہیں ہے مسجدِ جامع جہاں نہیں
سنتے بھی ہو میاں! ہمیں جانا وہاں نہیں

اپنے دکن کو آپ روانہ شتاب ہو
پر اس چمن کو چھوڑ کے ہم کیوں خراب ہوں

ہم اپنی دلّی چھوڑ دکن کو نہ جائیں گے
گڑیاں بہت نہ کھائیں گے تھوڑا ہی کھائیں گے

(۳)

ایسے ہی تنگ حبِ وطن بدنصیب ہیں
گھر میں مسافروں سے جو بدتر غریب ہیں

کہتے ہیں دکھ اٹھانا ہو یا درد سہنا ہو
تھوڑا سا کھاتا ہو پہ بنارس میں رہنا ہو

جو واقعہ لکھا ہے اس کا تاثر برقرار ہے، جو بات کہی ہے اس کا لہجہ موزوں ہے اور آخر تک اس آہنگ کو برقرار رکھا ہے۔

حالی اور آزاد کا مقابلہ انیس و دبیر، میر و سودا کا مقابلہ ہے۔ میں صرف اس بنیادی نکتہ کی طرف توجہ دلانا چاہتا تھا کہ حالی کے نفسیات ناقد اور خطیب مصلح اور اصلاح پسند افراد کی ہمنوائی کرنے والوں کے جیسے ہیں۔ آزاد جدت پسند، زبان و بیاں کے پاسبان ہیں۔ خیالات سے افکار پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ خطابت کے بجائے شعریت کے پرستار ہیں، حالی سادگی پر فریفتہ ہیں، آزاد رنگینی پر عاشق ہیں۔

حالی کی زبان عوام کے بول بولتی ہے۔ آزاد ثقہ لہجے میں بات کرتے ہیں۔ حالی درد دل کہتے ہیں اور دکھی معلوم ہوتے ہیں۔ آزاد مُلک و قوم کے حال پر گفتگو کرتے ہیں مگر درد انگیزی پہ زور دینے کے بجائے لوگ ابھرہ کا رنگ دے کر ــــ حالی ہم سے ہماری کہانی کہتے ہیں آزاد ہمیں ایک داستان سُناتے ہیں۔ دونوں جدت پسند ہیں۔ حالی ــــ ہنر کو کر دکھاؤ انگلستاں ــــ کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ آزاد کہتے ہیں ؎

سب اپنے حاکموں کے لئے جاں نثار ہوں
اور گردنِ حریف پہ خنجر کی دھار ہوں

آزاد اپنی روایت پر اعتماد کرتے ہیں، وہ حاکموں پر جان نثاری کا مشورہ بھی دیتے ہیں اور حریف کی شہ رگ کاٹنے پر بھی اُکساتے ہیں۔

ابتدائی تین چار مثنویوں کے بعد مولانا حالی کی باقی مثنویاں اخلاقی مثنویاں ہیں سوائے "بیوہ کی فریاد" کے ــــ بیوہ کی فریاد، حالی کا بہت بڑا شعری کارنامہ ہے۔ اِس میں مسدس مدّ و جزر کا سا جوش، اور "برکا رُت" کی سی لے، ہمدردی کا بھرپور جذبہ اور مکمل ترجمانی ہے۔

اے سب سے اول اور آخر   جہاں تہاں، حاضر و ناظر
اے اندھوں کی آنکھ کے تارے   اے لنگڑے لولوں کے سہارے
ناؤ جہاں کی کھینے والے   دُکھ میں تسلّی دینے والے

خطاب کی لذت، بیان کا جوش، درد کا اظہار، ایمان کا مظاہرہ، شکوہ کا طور، حکایت کا انداز غرض تمام شاعرانہ خوبیاں موجود ہیں، ہر قسم کا فنی کمال موجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حالی جیسے اس مناجات میں کھلے ہیں اس کا جواب نہیں کلیات حالی میں مناجات بیوہ شاہکار ہے حالی دراصل مسدس تو ہے مدّ و جزر اور مناجات کے

شاعری یوں مرثیہ غالب بھی کمتر درجے کی چیز نہیں۔ بلکہ ہر چیز اپنے معیار پر خوب ہے۔ مگر "مناجات بیوہ" کا عالم ہی جدا ہے۔

رہے مناظرے ـــــ رحم و انصاف کا مناظرہ، تعصب و انصاف کا مقابلہ، پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ، دولت اور وقت کا مناظرہ ـــــ سب کا رنگ وہی عام رنگِ حالی ہے اس میں فارسی قصائد کا زور اور پرانے کلاسیکی عربی و فارسی کے مناظروں جیسا آہنگ نہیں ہے، افادیت پر زور ہے، مفید باتیں سمجھانے کی طرف دھیان دیا گیا ہے۔

حالی اور مثنوی نگاری اس سلسلے کا آخری باب ہے۔ اُسے آخر میں اس لئے رکھا ہے کہ حالی کی مثنویاں اُردو ادب میں خاصے کی چیز ہیں۔ آزاد اور حالی نے نیچرل شاعری اور شعر میں انقلابی تحریک کے مثالیے اور نمونے پیش کرنے کے لئے مثنوی کی ہیئت اور تکنیک پسند کی تھی۔ مسلسل بیان کے لئے مثنوی، مسدس، ترکیب بند، ترجیع بند وغیرہ سے زیادہ موزوں سمجھی۔ مولانا حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں مثنوی پر مفصل بحث کی ہے۔ قدیم و جدید مشہور مثنویوں کی تحلیل کی ہے۔ اس کے حدود و اوصاف بیان کئے ہیں، اصول و قواعد لکھے ہیں ـــــ اس بحث کا آغاز کرتے ہوئے پہلا جملہ ہی ان کی رائے کا برملا اظہار ہے ـــــ

> "مثنوی اصناف سخن میں سب سے زیادہ بکار آمد صنف ہے کیونکہ غزل یا قصیدہ میں اس وجہ سے کہ اوّل سے آخر تک ایک قافیہ کی پابندی ہوتی ہے[1]۔ ہر قسم کے مسلسل مضامین کی گنجائش نہیں ہو سکتی ـــــ
>
> مسدس میں یہ دقت ہے کہ ہر بند میں چار قافیے ایک طرح کے اور دو ایک طرح کے لانے پڑتے ہیں۔ پس اس میں مسلسل مضامین ایسی خوبی سے بیان کرسکے کہ مطالب برابر بے کم و کاست ادا ہوتے چلے جائیں اور قافیوں کی نشست

---

[1] حالی نے سب سے پہلے شدت کے ساتھ قافیہ کی ضرورت ہونے نہ ہونے کی بحث کو اٹھایا ہے۔

اور روزمرہ کا سررشتہ ہاتھ سے نہ جائے ہر شخص کا کام نہیں ہے[1]۔

ترجیع بند بھی مسلسل مضامین کی گواہ نہیں ہے، کیونکہ اس میں ہر بند کے آخر میں ایک ترجیع کا شعر بار بار آتا ہے جو سلسلہ کلام کو منقطع کر دیتا ہے۔

ترکیب بند کے آخر اگر تمام بندوں میں بیتوں کی تعداد برابر رکھی جائے تو بھی ایسی ہی دقت پیش آتی ہے۔ کیونکہ اس کے ایک بند میں صرف ایک پوائنٹ عمدگی سے بیان ہو سکتا ہے"۔ (مقدمہ، ص ۱۹۲)

مثنوی کی ٹکنیک اور حدود پر باقاعدہ بحث کرتے ہوئے اس کے لئے آٹھ شرطیں قلم بند کی ہیں:

۱۔ بیتوں اور مصرعوں کی ترتیب ایسی سنجیدہ ہو کہ ہر مصرع دوسرے مصرع سے اور ہر بیت دوسری بیت سے چسپاں ہوتی چلی جائے اور دونوں کے بیچ میں کہیں ایسا کھانچا باقی نہ رہ جائے کہ جب تک کچھ عبارت مقدر نہ مانی جائے تب تک کلام جیسا کہ چاہیئے مربوط اور منتظم نہ ہو۔

۲۔ جو قصہ بیان کیا جائے اُس کی بنیاد ناممکن اور فوق العادت باتوں پر نہ رکھی جائے۔

۳۔ انتہا سے انتہا درجے کا مبالغہ[2] بھی اس سے زیادہ نہیں ہونا چاہیئے کہ جو کچھ کسی چیز کی تعریف یا مدح یا ذم میں کہا جاتے گو وہ اس چیز کے حق میں صحیح نہ ہو مگر کسی نہ کسی چیز پر صادق آسکتا ہو۔۔۔۔ اس کا اثر سامع کے دل پر نہایت قوت کے ساتھ ہو۔

۴۔ مقتضائے حال کے موافق کلام ایراد کرنا۔۔۔۔ بلاغت کا بھید صرف اسی بات میں چھپا ہوتا ہے۔

---

[1] گویا مثنوی کے بعد مسدس پسندیدہ صنف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے پہلے مثنویاں لکھیں اور پھر مسدس مدوجزر۔ [2] مبالغہ کے معاملے میں مولانا بہت زیادہ انتہا پسند واقع ہوئے ہیں۔

۵۔ جو حالت کسی شخص یا کسی چیز یا مکان وغیرہ کی بیان کی جائے وہ لفظاً اور معناً نیچرل اور عادت کے موافق ہو، ایسی ہونی چاہیئے کہ فی الواقعہ ہوا کرتی ہے۔

۶۔ ایک بیان دوسرے بیان کی تکذیب نہ کرے کیونکہ اس سے قصّہ نگار کا پھوہڑپن ثابت ہوتا ہے۔

۷۔ کوئی بات ایسی بیان نہ کی جائے جو تجربہ اور مشاہدے کے خلاف ہو، جس طرح ناممکن اور فوق العادت باتوں پر قصّہ کی بنیاد رکھنی آجکل زیبا نہیں ہے، اسی طرح قصّے کے ضمن میں ایسی جزئیات بیان کرنی جس کی تجربہ اور مشاہدہ تکذیب کرتا ہو، ہرگز جائز نہیں ہے۔

۸۔ جس طرح ان اہم اور ضروری باتوں کو جس پر قصّہ کی بنیاد رکھی گئی ہے نہایت صراحت کے ساتھ بیان کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح ان ضمنی باتوں کو جو صاف صاف کہنے کی نہیں ہیں رمز و کنایہ میں بیان کرنا ضروری ہے[1]

حالی کا اندازِ بحث بتاتا ہے کہ انہوں نے اُردو کی مشہور مثنویوں کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اس فن کی گہرائیوں میں اُترے ہیں اور اس کی اچھائیاں بُرائیاں سمجھ لی ہیں لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے خود کوئی عشقیہ مثنوی نہیں لکھی۔ کسی کہانی کو براہِ راست موضوع نہیں بنایا۔ اصل میں انہیں قصّہ گوئی سے دلچسپی نہیں۔ لے دے کے نظریات اور تعلیمات ہی ان کے پیشِ نظر تھے، وہی انہوں نے بیان کئے اور حتی الامکان اپنے معین کردہ اصولوں سے سرِمو انحراف نہیں کیا۔

ہم بلا تکلف کہہ سکتے ہیں کہ حالی کے عقیدہ و عمل، خیال و اظہار میں تضاد نہیں۔ ان کا مقصدِ زندگی سچائی کا پرچار تھا۔ وہ شعر جیسے پیچیدہ فن میں سچائی کی بلندی دکھا کر رہے۔

شخصی زندگی، قومی شعور، سیاست و اخلاق کو موضوع بنانے والے حالی کی عظمت یہ ہے کہ اس نے مجازات سے منہ موڑا، حقائق سے بحث کی۔ اس نے شاعری کو تجربہ

---

[1] مقدمہ میں یہ بحث بیس صفحات پر مشتمل ہے۔

سے عام مشاہدے میں منتقل کیا، مناظرِ قدرت کو وطن کے آئینے میں دیکھا، واقعیت کو اہمیت بخشی اور عام ذہن کے پیمانے سے حالات کو تولا اور عصری تقاضوں کو لبیک کہنے والوں کی ہمت افزائی کی۔ تعلیم و تمدن کو نئے اقدار کے ساتھ قبول کیا اور آنے والوں کے لئے ایک نئے دبستان کی بنیاد قائم کی ٭

ماٰخذ

معاصر نسخے

۱۔ برکھارت	نول کشور گیس پریس ورکس لاہور سنہ
۲۔ حب وطن	کیمبرہ آرٹ پرنٹنگ پریس لاہور سنہ
۳۔ ایک بیوہ کی مناجات	مصطفائی پریس لاہور
۴۔ شکوہ ہند	مشہور عالم پریس لاہور
۵۔ پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ	کریمی پریس لاہور
۶۔ ننگ خدمت	کریمی پریس لاہور
۷۔ دیوان حالی	نامی پریس کانپور ۱۸۹۳ء طبع اوّل
۸۔ مثنوی عرق اولاد	کریمی پریس لاہور
۹۔ مجموعہ نظم حالی	؟
۱۰۔ مثنویات حالی	سرفراز صبوحی پریس لکھنؤ ۱۹۶۰ء
۱۱۔ دیوان حالی	انوار المطابع لکھنؤ ۱۹۲۶ء
۱۲۔ نظم آزاد	آغا محمد باقر صاحب لاہور ۱۹۵۷ء
۱۳۔ مسدس مدوجزر اسلام	دہلی
۱۴۔ تاریخ نظم و نثر اردو	آغا محمد باقر لاہور ۱۹۴۵ء
۱۵۔ تاریخ ادب اردو	محمد عسکری لکھنؤ طبع دوم
۱۶۔ مختصر تاریخ ادب اردو	اعجاز حسین ایم۔اے لاہور ۱۹۴۸ء
۱۷۔ مراۃ الشعراء	محمد یحییٰ تنہا، لاہور طبع دوم
۱۸۔ جواہرات حالی	محمد اسماعیل ۱۹۲۳ء
۱۹۔ تلامذۂ غالب	مالک رام، طبع اوّل
۲۰۔ کلیات اسماعیل	محمد اسلم سیفی، دہلی ۱۹۳۹ء
۲۱۔ کیا خوب آدمی تھا	حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی، طبع دوم

تنقید و مباحث

۱۔ مقدمہ شعر و شاعری — ۱۸۹۳ء طبع اوّل

۲۔ جدید اُردو شاعری — عبدالقادر سروری : غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۶۲ء

۳ مطالعہ حالی — شجاعت علی۔ ناظر کاکوروی۔ لکھنؤ ۱۹۵۶ء

۴۔ حالی اور مسدس مدوجزر اسلام — جیلانی کامران۔ صحیفہ۔ لاہور شمارہ ۲۷

۵۔ مولانا حالی اور مزاح — محمد منور ، صحیفہ، ۲۷ اپریل ۱۹۶۴ء

۶۔ حالی کا نقطۂ نظر — ممتاز حسین } تنقیدی رس، لاہور

۷۔ حالی کا سیاسی شعور — احتشام حسین } طبع لاہور ۱۹۶۰ء

۸۔ تاریخ مثنویات اُردو — جلال الدین ، طبع لاہور، طبع دوم

۹۔ اُردو مثنوی کا ارتقاء — عبدالقادر سروری ، کراچی ۱۹۶۶ء

۱۰۔ اُردو شاعری کا مزاج — وزیر آغا لاہور ۱۹۶۵ء

۱۱۔ حالی جادو بیاں — عبدالحق ماہ نو، مارچ ۱۹۵۸ء

۱۲۔ حالی بحیثیت نقاد — ممتاز حسین ماہ نو جنوری ۱۹۵۶ء

۱۳۔ حالی اور دُنیائے اسلام — محمد امین زبیری ماہ نو، مارچ ۱۹۵۳ء

۱۴۔ حالی اور حکیم — محمد عبداللہ ماہ نو، نومبر ۱۹۶۵ء

۱۵۔ نوائے دوش — آمنہ صدیقہ ماہ نو، جون ۱۹۵۳ء

۱۶۔ حالی ایک زندہ فیضان — ابوالنصا صدیقی ماہ نو، جنوری ۱۹۶۲ء

۱۷۔ حالی کا مذہبی تصور — ڈاکٹر فاطمہ شجاعت، اُردو سہ ماہی کراچی جنوری ۱۹۶۶ء

۱۸۔ حالی قطعہ نگاری — ڈاکٹر سید عبداللہ نقوش، اگست ۱۹۶۰ء

سوانح حالی کے
چند اہم واقعات اور تاریخیں

ولادت	۱۸۳۷ء / ۱۲۵۳ھ (غالباً)
والد کی وفات	۱۸۴۶ء
شادی	۱۸۵۴ء
پہلا مؤلفہ رسالہ	۱۸۵۵ء
ملازمت کرنال	۱۸۵۶ء — ۱۸۵۷ء
جہاد آزادی اور قیام پانی پت	۱۸۵۷ء — ۱۸۶۰ء
شیفتہ سے تعلق	۱۸۶۱ء — ۱۸۶۹ء
تالیف رسالہ مولود	۱۸۶۴ء ؟ بعد
رسالہ تریاق مسموم	۱۸۶۷ء بعد
اصول فارسی	۱۸۶۸ء
ملازمت لاہور	۱۸۷۰ء بعد
ترجمۂ طبقات الارض	۱۸۷۱ء بعد
مجالس النساء	۱۸۷۴ء
نیچرل شاعری کا آغاز	۱۸۷۴ء
شواہد الالہام	۱۸۷۵ء
اینگلو عربک اسکول دہلی کی مدرسی	۱۸۷۵ء — ۱۸۹۲ء
مسدس مد و جزر اسلام	۱۸۷۹ء
سوانح ناصر خسرو	۱۸۸۱ء

حیات سعدی	۱۸۸۴ء
ابراہیم حسین برادر حالی کی وفات	۱۸۸۵ء
ایچیسن کالج، لاہور میں	۱۸۸۷ء
سفر حیدر آباد، اور وظیفہ	۱۸۸۸ء
سفر حیدر آباد اور اضافۂ وظیفہ و ترک ملازمت	۱۸۹۲ء
مقدمہ و دیوان کی طباعت	۱۸۹۳ء
یادگارِ غالب	۱۸۹۷ء
حیات جاوید	۱۹۰۱ء
خطاب شمس العلماء	جون ۱۹۰۴ء
مرثیہ ملکہ وکٹوریہ معہ ترجمہ انگریزی	جنوری ۱۹۵۴ء
تاسیس، وکٹوریہ پبلک لائبریری، پانی پت	۱۹۰۵ء
ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ کراچی کی صدارت	۱۹۰۷ء
سفر میرٹھ[1]	۱۹۰۵ء — ۱۹۰۹ء ۱۹۱۰ء
سفر غازی آباد	۱۹۱۲ء

---

[1] میرٹھ میں مولانا کے داماد غلام الثقلین رہتے تھے۔ یہ تاریخیں تنہا اور اسلم سیفی نے لکھی ہیں۔

سفر فرید آباد		۱۹۱۲ء
طبع ضمیمۂ اردو کلیات نظم حالی		اگست ۱۹۱۴ء
وفات	۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء ۱۳ صفر ۱۳۳۳ھ	

(۱)

جوانمردی کا کام

۱۸۷۲ء

یہ حکایت ایک انگریزی نثر سے لی گئی ہے اور اس کو اُردو میں
باضافۂ بعض خیالات نظم کیا گیا ہے۔

تھا کسی مُلک میں اِک دَولت مند — حق نے تین اس کو دیے تھے فرزند
دُور و نزدیک تھا گھر گھر چرچا — باپ بیٹوں کی جوانمردی کا
باپ ہوں جن کے مروّت والے — بیٹے پھر کیوں نہ ہوں ہمّت والے
ہو چکا عمر کا جب سرمایہ — ایک دن باپ کے جی میں آیا
گھر ہے تکرار کا یہ دَولت و زر — مشترک چھوڑ مرے اس کو اگر
جلد ہو جائے کہیں یہ تقسیم — آخر اک روز ہے مرنا تسلیم
بس کہ تھا اس کو فکرِ مآل — ایک دن بیٹھ کے سب مال ومنال
اِک گراں مایہ جواہر کے سوا — تینوں بیٹوں کو وہیں بانٹ دیا
پھر کہا اُن سے کہ اے اہلِ ہنر — باپ کی جان فدا ہو تم پر
تم میں جس سے ہو بڑا کام کوئی — یہ جواہر ہے امانت اُس کی
باپ نے اُن سے کہا جب یہ سخن — پھر تو تینوں کو لگی اَور ہی دُھن
کہ کوئی کارِ نمایاں کیجے — جس طرح ہو یہ جواہر لیجے
اُن میں بیٹا جو بڑا تھا سب سے — اس کو یہ فکر سوا تھا سب سے
ایک دن اس کا کوئی واقف کار — کہ نہ تھا جس سے کچھ اخلاص و پیار

رکھ گیا آ کے جوانمرد کے پاس — ایک بھاری سی رقم بے وسواس
تھے رقم سے وہی دونوں آگاہ — نہ نوشتہ تھا کوئی اور نہ گواہ
کچھ بھی نیت میں اگر آ جاتے خلل — تو یہ تھا عین خیانت کا محل
جب رقم اُس نے طلب کی اُس سے — وسوسے دل میں بہت سے آئے
مگر اُس شیر کی نیت نہ پھری — دی تھی جن ہاتھوں اُنہی ہاتھوں دی
نفسِ سرکش کو کیا مات اُس نے — دی رقم اور نہ دی بات اُس نے
صاحبِ زر نے جو کچھ نذر کیا — وہ بھی اُس دل کے غنی نے نہ لیا
باپ کو آن کے دی جب یہ خبر — ہنس کے فرمایا کہ اے جانِ پدر!
اِک بُرائی سے بچے تم تو کیا، — اِس سے بڑھ کر بھی کوئی کام کیا؟

اِک خیانت کے نہ کرنے پہ یہ ناز
شرم کی جا ہے، تری عمر دراز

منجھلے بیٹے نے پھر اک دن یہ کہا، — مَیں جو دریا کی طرف جا نکلا،
دیکھتا کیا ہوں کہ اک طفلِ صغیر — گر کے پانی میں چلا صورتِ تیر
تھا جہاں یار نہ کوئی یاور — ماں کا پہلو تھا نہ آغوشِ مادر
آنکھ تھی جانبِ مادر نگراں — ماں کنارے پہ اِدھر تھی حیراں
گرچہ تھا کام خطرناک بڑا — پر اُسے دیکھ کے دل رہ نہ سکا
جان و تن کی نہ رہی مجھ کو خبر — جا پڑا نام خُدا کا لے کر
جان تو جا ہی چکی تھی اس کی — پر مری شرم خدا نے رکھ لی
ایک دم بھر میں گیا اور آیا — لا کے بیٹے کو دیا ماں سے مِلا
باپ نے سُن کے یہ سب اُس سے کہا — کام مردوں کے یہی ہیں بیٹا!
آدمیت کا کیا تُم نے کام — جاؤ بس ہے یہی اس کا اِنعام
فخر کی جا یہ مری جاں کیا ہے؟ — نہ ہوا اتنا بھی تو انساں کیا ہے؟

پسرِ خورد کا اب سُنئے بیان　　　جو کہ تھا سب سے بزرگی میں کلاں
عرض کرتا ہے بصد عجز و نیاز　　　باپ سے اپنے کہ اے بندہ نواز
بات گو لائقِ اظہار نہیں　　　آپ سے کہنے میں کچھ عار نہیں
خُوب اِک روز گھٹا چھائی تھی　　　رات آدھی کے قریب آئی تھی
شبِ تاریک میں وہ ابرِ سیاہ　　　کہ جہاں کام نہ کرتی تھی نگاہ
اِک پہاڑی پہ چلا جاتا تھا،　　　خوف چھاتی پہ چڑھا جاتا تھا
ساتھ تم سے تھے نہ کوئی بھائی تھا　　　مَیں تھا اور عالمِ تنہائی تھا
کوندی اِک سمت سے بجلی ناگاہ　　　جس سے آگے کو کھلی راہِ نگاہ
پڑی اِک غار پہ واں میری نظر　　　جس کی صورت سے برستا تھا خطر
موت کھولے ہوئے تھی منہ گویا　　　جس کے دیکھے سے جگر ہلتا تھا
دیکھتا کیا ہوں کہ اک مردِ غریب　　　جس کو روتے ہیں کھڑے اُسکے نصیب
جیسے رستے کا تھکا ہو کوئی　　　یا کہ جینے سے خفا ہو کوئی
جان و تن کا نہیں کچھ نیند میں ہوش　　　غار کے مُنہ میں پڑا ہے مدہوش
اپنی ہستی کی نہیں اُس کو خبر　　　اور قضا کھیل رہی سر پر
اجل آجائے تو ہے روک نہ تھام　　　ایک کروٹ میں ہے بس کام تمام
اتنے میں اَور جو بجلی چمکی　　　شکل پھر غور سے دیکھی اُس کی
مرد نکلا وہ شناسا میرا　　　تھا مگر خون کا پیاسا میرا
مجھ میں اور اُس میں عداوت گہری　　　ایک مدت سے چلی آتی تھی
واں عداوت پہ گر آؤں اپنی　　　اور اصالت پہ نہ جاؤں اپنی
مارنا اُس کا نہ تھا کچھ دشوار　　　اِک اشارہ میں وہ تھا لقمۂ غار
آگیا مجھ کو مگر خوفِ خدا　　　اور پہلو سے یہ دی دل نے صدا
مرتے کو مارنا بے دردی سے　　　ہے بہت دُور جواں مردی سے
حوصلہ کا ہے یہی وقت، کہ آج　　　ہے عدُو اپنی مدد کا محتاج

جی میں یہ کہہ کے بڑھا جانبِ غار — کہ اسے کیجئے چل کر بیدار
واں سے جا اُس کو اُٹھا لایا میں — موت کی زد سے بچا لایا میں
منہ کو دامن سے مگر ڈھانک لیا
اُس کو شرمندۂ احساں نہ کیا

سُن کے دی باپ نے بیٹے کو دُعا — اور چھاتی سے لیا اُس کو لگا
پھر بڑے بیٹوں کو بُلوا کے کہا — بولو، اب کس سے ہوتا کام بڑا؟
داستاں جب یہ سُنی دونوں نے — باپ سے عرض کی یہ دونوں نے
خانہ زادوں کی ہو تقصیر مُعاف — پُوچھیے ہم سے تو ہے یہ انصاف
جس جواہر کے طلبگار تھے ہم — اس کے لائق تھے نہ حقدار تھے ہم
اور اُس کی ہوس ناحق ہے — حق یہی ہے کہ وہ اس کا حق ہے
باپ یہ سُن کے ہوا شاد بہت — اُن کے انصاف کی دی داد بہت
چھوٹے بیٹے کو بُلا کر پھر پاس — پہلے خالق کا کیا شُکر و سپاس
پھر جواہر اُسے دے کر یہ کہا
لو، یہ ہو تم کو مُبارک بیٹا

---

(۲)

برکھا رُت

سنہ ۱۸۷۴ء

گرمی کی تپش بجھانے والی — سردی کا پیام لانے والی
قدرت کے عجائبات کی کان — عارف کے لئے کتاب عرفان
وہ شاخ و درخت کی جوانی — وہ مور و ملخ کی زندگانی
وہ سارے برس کی جان برسات — وہ کون؟ خدا کی شان برسات
آئی ہے بہت دُعاؤں کے بعد — اور سینکڑوں التجاؤں کے بعد
وہ آئی تو آئی جان میں جان — سب تھے کوئی دن کے مہمان
گرمی سے تڑپ رہے تھے جاندار — اور دھوپ میں تپ رہے تھے کہسار
بھوبل سے سوا تھا ریگِ صحرا — اور کھول رہا تھا آبِ دریا
تھی لُوٹ سی پڑ رہی چمن میں — اور آگ سی لگ رہی تھی بَن میں
سانڈے تھے بلوں میں مُنہ چھپائے — اور ہانپ رہے تھے چارپائے
تھیں لُومڑیاں زباں نکالے — اور لُو سے ہرن ہوئے تھے کالے
چیتوں کو نہ تھی شکار کی سُدھ — ہرنوں کو نہ تھی قطار کی سُدھ
تھے شیر پڑے کچھار میں سُست — گھڑیال تھے رود بار میں سُست
ڈھوروں کا ہوا تھا حال پتلا — بیلوں نے دیا تھا ڈال کندھا
بھینسوں کے لہو نہ تھا بدن میں — اور دُودھ نہ تھا گؤ کے تھن میں
گھوڑوں کا چھٹا تھا گھاس دانہ — تھا پیاس کا اُن پہ تازیانہ

گرمی کا لگا ہوا تھا بھبکا — اور اُنس نکل رہا تھا سب کا
طوفاں تھے آندھیوں کے برپا — اُٹھتا تھا بگولے پر بگولا
آرے تھے بدن پر لُو کے چلتے — شعلے تھے زمین سے نکلتے
تھی آگ کا دے رہی ہوا کام — تھا آگ کا نام مفت بدنام
رستوں میں سوار اور پیدل — سب دھوپ کے ہاتھ سے تھے بیکل
گھوڑوں کے نہ آگے اٹھتے تھے پاؤں — ملتی تھی کہیں جو روکھ کی چھاؤں
تھی سب کی نگاہ سُوئے افلاک — پانی کی جگہ برستی تھی خاک
پنکھے سے نکلتی جو ہوا تھی — وہ بادِ سموم سے سوا تھی
بجھتی نہ تھی آتشِ درُونی — لگتی تھی ہوا سے آگ دُونی
سات آٹھ بجے سے دن چھپے تک — جانداروں پہ دُھوپ کی تھی دستک
ٹٹی[1] میں تھا دن گنواتا کوئی — تہ خانے میں منہ چھپاتا کوئی
بازار پڑے تھے سارے سُنسان — آتی تھی نظر نہ شکلِ انسان
چلتی تھی دُکان جن کی دن رات — بیٹھے تھے ہات پر دھرے ہات
خلقت کا ہجُوم کچھ اگر تھا — یا پیاؤ[2] پہ یا سبیل پر تھا
تھا شہر میں قحط آدمی زاد — سلطان[3] کا اک کنواں تھا آباد
پانی سے تھی سب کی زندگانی — میلہ تھا وہیں جہاں تھا پانی
تھیں برف پہ نیتیں لپکتی — فالودے پہ رال تھی ٹپکتی
پھل پھول کی دیکھ کر طراوت — پاتے تھے دل و جگر طراوت
کنجڑوں کی وہ بولیاں سُہانی — بھر آتا تھا سُن کے مُنہ میں پانی

---

[1] خس کے پردے، خس کی ٹٹی ۔ فاضل

[2] پیاؤ : ہندوؤں کے پانی کی سبیل ۔ فاضل

[3] لاہور میں جہاں یہ مثنوی لکھی گئی تھی ۔ایک سلطان کا کنواں مشہور ہے جس کا پانی نہایت ٹھنڈا ہوتا ہے اور گرمی کے موسم میں وہاں آدمیوں کا ہجوم رہتا ہے ۱۲ حالی

تھے جو خفقانی اور مراقی   گرمی سے نہ تھا کچھ ان میں باقی
کھانے کا نہ تھا اُنہیں مزا کچھ   آٹھ آٹھ پہر نہ تھی غذا کچھ
بن کھائے کئی کئی دن اکثر   رہتے تھے فقط ٹھنڈائیوں پر
شب کٹتی تھی ایڑیاں رگڑتے   مر پیٹ کے صبح تھے پکڑتے
اور صبح سے شام تک برابر   تھا العطش العطش زباں پر
بچوں کا ہوا تھا حال بے حال   کُمھلائے ہوئے تھے پھول سے گال
آنکھوں میں تھا اُن کا پیاس سے دم   تھے پانی کو دیکھ کرتے "مم، مم"
ہر بار پکارتے تھے ماں کو   ہونٹوں پہ تھے پھیرتے زباں کو
پانی دیا گر کسی نے لاکر   پھر چھوڑتے تھے نہ منہ لگا کر
بچے ہی نہ پیاس سے تھے مضطر   تھا حال بڑوں کا اُن سے بدتر

تخصیص تھی کچھ نہ میری تیری
پانی سے نہ تھی کسی کو سیری

کل شام تلک تو تھے یہی طور   پر رات سے ہے سماں ہی کچھ اور
پُروا کی دُہائی پھر رہی ہے   پچھوا سے خدائی پھر رہی ہے
برسات کا بج رہا ہے ڈنکا   اِک شور ہے آسماں پہ برپا
ہے اَبر کی فوج آگے آگے   اور پیچھے ہیں دَل کے دَل ہوا کے
ہیں رنگ برنگ کے رسالے   گورے ہیں کہیں کہیں ہیں کالے
ہے چرخ پہ چھاؤنی سی چھاتی   اک آتی ہے فوج ایک جاتی
چلتے ہیں مہم پہ کوئی جانے   ہمراہ ہیں لاکھوں توپ خانے
توپوں کی ہے جب کہ باڑ چلتی   چھاتی ہے زمین کی دہلتی
مینہ کا ہے زمین پر ڈریڑا   گرمی کا ڈبو دیا ہے بیڑا
بجلی ہے کبھی جو کوند جاتی   آنکھوں میں ہے روشنی سی آتی

گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں — جنّت کی ہوائیں آ رہی ہیں
کوسوں ہے جدھر نگاہ جاتی — قدرت ہے نظر خدا کی آتی
سورج نے نقاب لی ہے منہ پر — اور دھوپ نے تہہ کیا ہے بستر
باغوں نے کیا ہے غسلِ صحت — کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت
بٹیا[1] ہے نہ ہے سڑک نمودار — اٹکل سے ہیں راہ چلتے رہوار
ہے سنگ و شجر کی ایک وردی — عالم ہے تمام لاجوردی
پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار — دولھا سے بنے ہوئے ہیں اشجار
پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل — ہے گونج رہا تمام جنگل
کرتے ہیں پپیہے پیہو پیہو — اور مور جھنگاڑتے ہیں ہر سو
کویل کی ہے کوک جی لبھاتی — گویا کہ ہے دل میں بیٹھی جاتی
مینڈک جو ہیں بولنے پہ آتے — سنسار کو سر پہ ہیں اٹھاتے
سب خوانِ کرم سے حق کے ہیں سیر — پانی میں نگر، کچھار میں شیر
زردار ہیں اپنے مال میں مست — قلاش ہیں اپنی کھال میں مست
ابر آیا ہے گھر کے آسماں پر — کلمے ہیں خوشی کے ہر زباں پر
مسجد میں ہے وردِ اہلِ تقویٰ — یَا رَبِّ لَنَا وَ لَا عَلَیْنَا[2]
مندر میں ہے ہر کوئی یہ کہتا — کرپا ہوئی تیری میگھ راجا[3]
کہتے ہیں گرو گرو گر نہتی! — گاتے ہیں بھجن کبیر پنتھی
جاتا ہے کوئی ملار گاتا — ہے دیس میں کوئی گنگناتا
بھنگی ہیں نشے میں گاتے پھرتے — اور بانسریاں بجاتے پھرتے
سرود کوئی گا رہا ہے میٹھا — چھیڑا ہے کسی نے ہیر رانجھا

---

[1] کھیتوں کا درمیانی راستہ پگڈنڈی۔

[2] پروردگار! ہمیں اس سے فائدہ ہو، نقصان نہ پہنچے۔ فاضل

[3] بادل دیوتا نے ہم پر مہربانی کی ہے۔ فاضل

رکھشک جو بڑے ہیں جین مت کے
ڈھکتے ہیں دلوں پہ ڈھکتے پھرتے

کرتے ہیں وہ یوں جیون کی رکھیا
تا جل نہ بجھے کوئی پتنگا

ہیں شکر گذار تیرے برسات
انسان سے لے کے تا جمادات

دنیا میں بہت تھی چاہ تیری
سب دیکھ رہے تھے راہ تیری

تجھ سے ہے کھلا یہ رازِ قدرت
راحت ملتی ہے بعدِ کلفت

شکریۂ فیضِ عام تیرا
پیشانی دہر پر ہے لکھا

گلشن کو دیا جمال تو نے
کھیتی کو کیا نہال تو نے

طاؤس کو ناچنا بتایا
کوئل کو الاپنا سکھایا

جب مور ہے ناچنے پہ آتا
آپے سے ہے اپنے گذرا جاتا

کوئل کو نہیں قرار اِک پل
ایسی کوئی تو نے کوک دی کل

شب بھر میں ہوا سماں دگرگوں
کیا پڑھ دیا آکے تو نے افسوں

سوئے تو اساڑھ کا عمل تھا
اُٹھے تو سماں ہے ماہ کا سا

لاہور میں شب ہوئی تھی لیکن
کشمیر میں پہنچے جب ہوا دن

اُمرت سا ہوا میں بھر دیا کچھ
اِک رات میں کچھ سے کر دیا کچھ

دریا تجھ بن سسک رہے تھے
اور بن تری راہ تک رہے تھے

دریا میں تو نے ڈال دی جان
اور تجھ سے بنوں کو لگ گئی شان

جن جھیلوں میں کل تھی خاک اُڑتی
ملتی نہیں آج تھاہ اُن کی

جو دانے تھے خاک میں پریشاں
سب آکے چڑھائے تو نے پروان

دولت جو زمیں میں تھی مخفی
آگے ترے اُس نے سب اُگل دی

پڑتے تھے ڈلاؤ جس زمیں پر
واں سبزہ و گُل ہیں جلوہ گستر

جن پودوں کو کل تھے ڈھور چرتے
باتیں ہیں وہ آسماں سے کرتے

جن باغوں میں اُڑتے تھے بگولے
واں سینکڑوں اب پڑے ہیں جھولے

تھے ریت کے جس زمیں پہ انبار
ہے بیر بہٹیوں سے گلنار

کھم باغوں میں جا بجا گڑے ہیں — جھولے ہیں کہ سُو بسُو پڑے ہیں
کچھ لڑکیاں بالیاں ہیں کم سن — جن کے ہیں یہ کھیل کود کے دن
ہیں پھول رہی خوشی سے ساری — اور کھیل رہی ہیں باری باری
جب گیت ہیں سارے مل کے گاتی — جنگل کو ہیں سر پہ وہ اُٹھاتی
اک سب کو کھڑی جھلا رہی ہے — اک گرنے سے خوف کھا رہی ہے
ہے اُن میں کوئی ملہار گاتی — اور دوسری پینگ ہے چڑھاتی
گاتی ہے کبھی کوئی ہنڈولا — کہتی ہے کوئی بدیسی ڈھولا
اک جھولے سے وہ گری ہے جاکر — سب ہنستی ہیں قہقہے لگاکر
ندّی نالے چڑھے ہوئے ہیں — تیراکوں کے دل بڑھے ہوئے ہیں
گھڑ ناؤ پہ ہے سوار کوئی! — اور تیر کے پہنچا پار کوئی!
بگلوں کی ہیں ڈاریں آکے گرتی — مُرغابیاں تیرتی ہیں پھرتی
چکلے ہیں یہ پاٹ ندّیوں کے — دن بھر میں ہیں بیڑے جاکے لگتے
زوروں پہ چڑھا ہوا ہے پانی — موجوں کی ہیں صورتیں ڈرانی
ناویں ہیں کہ ڈگمگا رہی ہیں — موجوں کے تھپیڑے کھا رہی ہیں
ملّاحوں کے اُڑ رہے ہیں اوسان — بیڑے کا خدا ہی ہے نگہبان
منجدھار کی رَو بھی زور پر ہے
مچھلی کو بھی جان کا خطرہ ہے

بیزار اک اپنی جان و تن سے[1] — بچھڑا ہوا صحبتِ وطن سے

---

[1] یہاں سے آخیر تک کچھ اشعار بہ رعایت موسم اپنے حسب حال بے اختیار ٹپک پڑے (باقی صفحہ ۱۱۵)

غربت کی صعوبتوں کا مارا — چلنے کا نہیں ہے جس کو یارا
غمخوار ہے کوئی اور نہ دل جو — اک باغ میں ہے پڑا لبِ جو
ہیں دھیان میں کلفتیں سفر کی — اپنے کی خبر ہے اور نہ گھر کی
ابر اتنے میں اک طرف سے اٹھا — اور رنگ سا کچھ ہوا کا بدلا
برق آ کے لگی تڑپنے پیہم — اور پڑنے لگی پھوار کم کم
آنے جو لگے ہوا کے جھوکے — تھے جتنے سفر کے رنج بھولے
سامان ملے جو دل لگی کے — یاد آئے مزے کبھی کبھی کے
دیکھے کوئی اس گھڑی کا عالم — وہ آنسوؤں کی جھڑی کا عالم
وہ آپ ہی آپ گنگنانا — اور جوش میں آ کبھی یہ گانا
"اے چشمۂ آبِ زندگانی — گھٹیو نہ کبھی تری روانی
جاتی ہے جدھر تری سواری — بستی ہے اُسی طرف ہماری
پائے جو کہیں مری سبھا کو — دیتا ہوں میں بیچ میں خدا کو
اوّل کہیو سلام میرا — پھر دیجیو یہ پیام میرا
قسمت میں یہی تھا اپنی لکھا — فرقت میں تمہاری آئی برکھا
آتا ہے تمہارا دھیان جس دم — مرغابیاں تیرتی ہیں باہم
ہم تم یونہی صبح و شام اکثر — تالاب میں تیرتے تھے جا کر
جب سبزہ و گل ہیں لہلہاتے — صحبت کے مزے ہیں یاد آتے
ہم تم یونہی ہات میں دیئے ہات — پھرتے تھے ہوا میں کھاتے دن رات
جب پیڑ سے آم ہے ٹپکتا — میں تم کو اِدھر اُدھر ہوں تکتا
آخر نہیں پاتا جب کسی کو — دیتا ہوں دعائیں بے کسی کو
رت آم کی آئے اور نہ ہوں یار — جی اپنا ہے ایسی رت سے بیزار

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۴) میں ان دنوں ہجوم امراض اور دیگر عوارض کی وجہ سے لاہور میں رہنا فی الواقع نہایت شاق معلوم ہوتا تھا اور وطن کی طرف واپس آنے کے لیے کوشش کی جاتی تھی۔ ۱۲ حالی

تم میں جو ہے بوند تن پہ پڑتی — چنگاری سی ہے بدن پہ پڑتی
ہے سرد ہوا بدن کو لگتی — پر دل میں ہے آگ سی سُلگتی
پردیس میں سچ ہے کیا ہو جی شاد — جب جی میں بھری ہو دیس کی یاد
نشتر کی طرح تھی دل میں چُبھتی — فریاد یہ دردناک اُس کی
تھا سوز میں کچھ ملا ہوا ساز — ٹکڑا دل سن کے اُس کی آواز
حیرت رہی دیر تک کہ آخر — روتا ہے کہاں کا یہ مُسافر

پھر غور سے اِک نظر جو ڈالی
نکلا وہ ہمارا دوست حالی

---

(۳۱)

نشاطِ اُمید

سنہ ۱۸۷۴ء

اے مری اُمید میری جاں نواز   اے مری دل سوز میری کارساز
میری سپر اور مرے دل کی پناہ   درد و مصیبت میں مری تکیہ گاہ
عیش میں اور رنج میں میری شفیق   کوہ میں اور دشت میں میری رفیق
کاٹنے والی غمِ ایام کی   تھامنے والی دلِ ناکام کی
دل پہ پڑا آن کے جب کوئی دُکھ   تیرے دلاسے سے ملا ہم کو سُکھ
تُو نے نہ چھوڑا کبھی غربت میں ساتھ   تُو نے اُٹھایا نہ کبھی سر سے ہاتھ
جی کو ہوا گر کبھی عسرت کا رنج   کھول دیے تُو نے قناعت کے گنج
تجھ سے ہے محتاج کا دل بے ہراس   تجھ سے ہے بیمار کو جینے کی آس
خاطرِ رنجور کا درماں ہے تُو   عاشقِ مہجور کا ایماں ہے تُو
نوحؑ کی کشتی کا سہارا تھی تُو   چاہ میں یوسفؑ کی دل آرا تھی تُو
رام کے ہمراہ چڑھی رن میں تُو   پانڈووں کے بھی ساتھ پھری بن میں تُو
تُو نے سدا قیس کا بہلایا دل   تھام لیا جب کبھی گھبرایا دل
ہو گیا فرہاد کا قصہ تمام   پر ترے فقروں پہ رہا خوش مدام
تُو نے ہی رانجھے کی یہ بندھوائی آس   ہیر تھی فرقت میں بھی گویا کہ پاس
ہوتی ہے تُو پشت پہ ہمت کی جب   مشکلیں آساں نظر آتی ہیں سب
ہاتھ میں جب آ کے لیا تُو نے ہات   سات سمندر سے گذرنا ہے بات

ساتھ بلا جس کو ترا دو قدم — کہتا ہے وہ یہ ہے عرب و عجم
گھوڑے کی لی اپنے جہاں تُو نے باگ — سامنے ہے تیرے گیا اور پراگ
عزم کو جب دیتی ہے تو میل جست — گنبدِ گردوں نظر آتا ہے پست
تُو نے دیا آکے اُبھارا جہاں — سمجھے کہ مٹھی میں ہے سارا جہاں

ذرّے کو خورشید میں دے تو کھپا
بندے کو اللہ سے دے تُو ملا

دونوں جہاں کی ہے بندھی تجھ سے لڑ — دین کی تو اصل ہے دُنیا کی جڑ
نیکیوں کی تجھ سے ہے قائم اساس — تو نہ ہو تو جائیں نہ نیکی کے پاس
دین کی تجھ بن کہیں پرستش نہ ہو — تو نہ ہو تو حق کی پرستش نہ ہو
خشک تھا بن تیرے درختِ امل — تُو نے لگائے ہیں یہ سب پھول پھل
دل کو لبھاتی ہے کبھی بن کے حُور — گاہ دکھاتی ہے شرابِ طہور
نام ہے سدرہ کبھی طوبیٰ ترا — روز نرالا ہے تماشا ترا
کوثر و تسنیم ہے یا سلسبیل — جلوے ہیں سب تیرے یہ بے قال و قیل
روپ ہیں ہر پنتھ میں تیرے الگ — ہے کہیں فردوس کہیں ہے سُرگ
چھوٹ گئے سارے قریب اور بعید — ایک نہ چھوٹی تو نہ چھوٹی اُمید
تیرے ہی دم سے کٹے جو دن تھے سخت — تیرے ہی صدقہ سے ملا تاج و تخت
خاکیوں کی تجھ سے ہے ہمت بلند — تو نہ ہو تو کام ہوں دُنیا کے بند
تجھ سے ہی آباد ہے کون و مکاں — تُو نہ ہو تو ہے ابھی برہم جہاں
کوئی پڑا پھرتا ہے بہرِ معاش — ہے کوئی اکسیر کو کرتا تلاش
ایک تمنا میں ہے اولاد کی — ایک کو دلدار کی ہے لو لگی
ایک کو ہے دھن کہ جو کچھ ہاتھ آئے — دھوم سے اولاد کی شادی رچائے
ایک کو کچھ آج اگر مل گیا — کل کی ہے یہ فکر کہ کھائیں گے کیا
قوم کی بہبود کا بھوکا ہے ایک — جس میں ہو ان کے لیے انجام نیک

ایک کو ہے تشنگیِ قربِ حق
جس نے کیا دل سے جگر تک ہے شق

جو ہے غرض اُس کی نئی جستجو
لاکھ اگر دل ہیں تو لاکھ آرزو

تجھ سے ہیں دل سب کے مگر باغ باغ
گل کوئی ہونے نہیں پاتا چراغ

سب یہ سمجھتے ہیں کہ پائی مراد
کہتی ہے جب تو کہ اب آئی مراد

وعدہ ترا راست ہو یا ہو دروغ
تو نے دیئے ہیں اُسے کیا کیا فروغ

وعدہ وفا کرتی ہے گو چند تو
رکھتی ہے ہر ایک کو خورسند تو

بھاتی ہے سب کو تری یہ لیت و لعل
تو نے کہاں سیکھی ہے یہ آج کل

تلخ کو تو چاہے تو شیریں کرے
بزمِ عزا کو طرب آگیں کرے

آنے نہ دے رنج کو مفلس کے پاس
رکھے غنی اس کو رہے جس کے پاس

یاس کا باقی ہے جو تو کچھ لگاؤ
سیکڑوں کرتی ہے اُتار اور چڑھاؤ

آنے نہیں دیتی دلوں پہ ہراس
ٹوٹنے دیتی نہیں طالب کی آس

جن کو میسر نہیں کملی پھٹی
خوش ہیں توقع پہ وہ زر بفت کی

چٹنی سے روٹی کا ہے جن کی بناؤ
بیٹھے پکاتے ہیں خیالی پلاؤ

پاؤں میں جوتی نہیں پر ہے یہ شوق
گھوڑا جو سبزہ ہو تو نیلا ہو طوق

فیض کے کھولے ہیں جہاں تو نے باب
دیکھتے ہیں جھونپڑے محلوں کے خواب

تیرے کرشمے ہیں غضب دلفریب
دل میں نہیں چھوڑتے صبر و شکیب

تجھ سے ہوس نے جو شوری لیا
پھونک دیا کان میں کیا جانے کیا

دل سے بھلایا زن و فرزند کو
لگ گیا گھن نخلِ برومند کو

کھانے سے پینے سے ہوا مرتجی
ایسی کچھ اکسیر کی ہے لو لگی

دین کی ہے فکر نہ دنیا سے کام
دھن ہے یہی رات دن اور صبح و شام

دھونکنی ہے بیٹھ کے جب دھونکتا
شہ کو سمجھتا ہے اِک ادنےٰ گدا

پیسے کو جب تاؤ پہ دیتا ہے تاؤ
پوچھتا یاروں سے ہے سونے کا بھاؤ

کہتا ہے جب ہنستے ہیں سب دیکھ کر
"رہ گئی اک آنچ کی باقی کسر"

ہے اسی دھندہ میں نہ آسودہ حال — تو نے دیا عقل پہ پردہ سا ڈال
تول کے گر دیکھیے اس کی خوشی — کوئی خوشی اس کو نہ پہنچے کبھی
پھرتے ہیں محتاج کئی تیرہ بخت — جن کے بڑوں میں تھا کبھی تاج و تخت
آج جو برتن ہیں تو کل گھر گرو — ملتی ہے مشکل سے انہیں نانِ جو
تیرے سوا خاک نہیں اُن کے پاس — ساری خدائی میں ہے لے دیکے آس
پھولے سماتے نہیں اس آس پہ — "صاحب عالم" انہیں کہیئے اگر
کھاتے ہیں اس آس پہ قسمیں عجیب — "چھوٹے کو ہو تخت نہ یارب نصیب"

ہوتا ہے نومیدیوں کا جب ہجوم — آتی ہے حسرت کی گھٹا جھوم جھوم
لگتی ہے ہمّت کی کمر ٹوٹنے — حوصلہ کا لگتا ہے جی چھوٹنے
ہوتی ہے بے صبری و طاقت میں جنگ — عرصۂ عالم نظر آتا ہے تنگ
جی میں یہ آتا ہے کہ سم کھائیے — پھاڑ کے یا کپڑے نکل جائیے
بیٹھنے لگتا ہے دل آوے کی طرح — یاس ڈراتی ہے چھلاوے کی طرح
ہوتا ہے شکوہ کبھی تقدیر کا — اُڑتا ہے خاکہ کبھی تدبیر کا
ٹھنتی ہے گردوں سے لڑائی کبھی — ہوتی ہے قسمت کی ہنسائی کبھی
جاتا ہے قابو سے دل آخر نکل — کرتی ہے ان مشکلوں کو تو ہی حل
کان میں پہنچی تری آہٹ جو ہیں — رختِ سفر یاس نے باندھا وہیں
ساتھ گئی یاس کے پژمردگی — ہوگئی کافور سب افسردگی

تجھ میں چھپا راحتِ جاں کا ہے بھید
چھوڑیو جانی کا نہ ساتھ اے اُمید

---

(۴)

حُبِّ وطن

۱۸۷۴ء

اے سپہرِ بریں کے سیارو — اے فضائے زمیں کے گلزارو!
اے پہاڑوں کی دلفریب فضا — اے لبِ جُو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
اے عنادل کے نغمۂ سحری — اے شبِ ماہتاب تاروں بھری
اے نسیمِ بہار کے جھوکو — دہرِ ناپائدار کے دھوکو
تم ہر اک حال میں ہو یُوں تو عزیز — تھے وطن میں مگر کچھ اَور ہی چیز
جب وطن میں ہمارا تھا رمنا[۱] — تم سے دل باغ باغ تھا اپنا
تم مری دل لگی کے ساماں تھے — تم مرے درد دل کے درماں تھے
تم سے کٹتا تھا رنجِ تنہائی — تم سے پاتا تھا دل شکیبائی
آن اک اک تمہاری بھاتی تھی — جو ادا تھی وہ جی لبھاتی تھی
کرتے تھے جب تم اپنی غمخواری — دھوئی جاتی تھیں کلفتیں ساری
جب ہوا کھانے باغ جاتے تھے — ہو کے خوشحال گھر میں آتے تھے
بیٹھ جاتے تھے جب کبھی لبِ آب — دھو کے اُٹھتے تھے دل کے داغِ شباب[۲]
کوہ و صحرا و آسمان و زمین — سب مری دل لگی کی شکلیں تھیں
پر چھُٹا جب سے اپنا ملک و دیار — جی ہوا تم سے خود بخود بیزار

---

[۱] طبع ملک فضل الدین میں "رَمنا" اور مجموعۂ نظم و مثنویات میں "رمنا" — رمنا: سبزہ زار۔ شکار گاہِ سلاطین — مرتضیٰ۔

[۲] طبع ملک فضل الدین میں شباب میں ب کا نقطہ نہیں ہے لیکن دونوں مجموعوں میں شباب ہے۔

نہ گلوں کی ادا خوش آتی ہے　　نہ صدا بلبلوں کی بھاتی ہے
سیرِ گلشن ہے جی کا اک جنجال　　شبِ مہتاب جان کو ہے وبال
کوہ و صحرا سے تا لبِ دریا　　جس طرف جائیں جی نہیں لگتا
کیا ہوئے وہ دن اور وہ راتیں　　تم میں اگلی سی اب نہیں باتیں
ہم ہی غربت میں ہو گئے کچھ اور　　یا تمہارے ہی کچھ بدل گئے طور
گو وہی ہم ہیں اور وہی دنیا　　پر نہیں ہم کو لطف دنیا کا

اے وطن اے مرے بہشتِ بریں　　کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں
رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا　　وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا
تیری دوری ہے موردِ آلام　　تیرے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام
کاٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے　　گل ہیں نظروں میں داغ بن تیرے
مٹ گیا نقش کامرانی کا　　تجھ سے تھا لطف زندگانی کا
جو کہ رہتے ہیں تجھ سے دور سدا　　اُن کو کیا ہوگا زندگی کا مزا
ہو گیا یہاں تو دو ہی دن میں یہ حال　　تجھ بن اک ایک پل ہے ایک اک سال
سچ بتا تو سبھی کو بھاتا ہے؟　　یا کہ مجھ سے ہی تیرا ناتا ہے
میں ہی کرتا ہوں تجھ پہ جان نثار　　یا کہ دنیا ہے تیری عاشقِ زار؟
کیا زمانہ کو تو عزیز نہیں؟　　اے وطن تُو تو ایسی چیز نہیں
جن و انسان کی حیات ہے تو　　مرغ و ماہی کی کائنات ہے تو
ہے نباتات کو نمو تجھ سے　　روکھ تجھ بن ہرے نہیں ہوتے
سب کو ہوتا ہے تجھ سے نشو و نما　　سب کو بھاتی ہے تیری آب و ہوا
تیری اک مشتِ خاک کے بدلے　　لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے
جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا　　کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا

حملہ جب قومِ آریا نے کیا   اور بجا اُن کا ہند میں ڈنکا
ملک والے بہت سے کام آئے   جو بچے وُہ غلام کہلائے
شودر کہلائے، راکشس کہلائے   رنج پردیس کے مگر نہ اٹھائے
گو غلامی کا لگ گیا دھبا   نہ چُھٹا اُن سے دیس، پر نہ چُھٹا

قدر اے دل، وطن میں رہنے کی   پوچھے پردیسیوں کے جی سے کوئی
جب ملا رامچندر کو بن باس   اور نکلا وطن سے ہو کے اُداس
باپ کا حکم رکھ لیا سر پر   پر چلا ساتھ لے کے داغِ جگر
پاؤں اُٹھتا تھا اس کا بن کی طرف   اور کھنچتا تھا دل وطن کی طرف
گذرے غربت میں اس قدر نہ سال   پر نہ بھولا اجودھیا کا خیال
دیس کو بن میں جی بھٹکتا رہا   دل میں کانٹا سا اک کھٹکتا رہا
تیر اک دل میں آ کے لگتا تھا   آتی تھی جب اجودھیا کی ہوا
کٹنے چودہ برس ہوئے تھے محال   گویا ایک ایک جُگ تھا ایک ایک سال

ہوئے یثرب کی سمت جب راہی   سید البطحیٰ کے ہمراہی
رشتے اُلفت کے سارے توڑ چلے   اور بالکل وطن کو چھوڑ چلے
گو وطن سے چلے تھے ہو کے خفا   پر وطن میں تھا سب کا جی اٹکا
دل لگی کے بہت ملے ساماں   پر نہ بھولے وطن کے ریگستاں
دل میں آٹھوں پہر کھٹکتے تھے   سنگریزے زمینِ بطحا کے
گھر جفاؤں سے جن کی چھوٹا تھا   دل سے رشتہ نہ اُن کا ٹوٹا تھا

ہوئیں یوسف کی سختیاں جب دُور   اور ہوا ملکِ مصر پر مامور
مصر میں چار سُو تھا حکم رواں   آنکھ تھی جانبِ وطن نگراں

یادِ کنعاں جب اُس کو آتی تھی — سلطنت ساری بھول جاتی تھی
دُکھ اُٹھائے تھے جس وطن میں سخت — تاج بھاتا تھا اُس بغیر نہ تخت
جن سے دیکھی تھی سخت بے مہری — لوٹتی اُن بھائیوں کی دل کو لگی

ہم بھی حُبِّ وطن میں گو ہیں غرق — ہم میں اور اُن میں ہے مگر یہ فرق
ہم ہیں نامِ وطن کے دیوانے — وہ تھے اہلِ وطن کے پروانے
جس نے یوسفؑ کی داستاں ہے سُنی — جانتا ہوگا روئداد اُس کی
مصر میں قحط جب پڑا آ کر — اور ہوئی قوم بھوک سے مضطر
کر دیا وقف اُن پہ بیت المال — لب تک آنے دیا نہ حرفِ سوال
کُٹھیاں[1] اور کوٹھے کھول دیے — مُفت سارے ذخیرے تول دیے
قافلے خالی ہاتھ آتے تھے — اور بھر پُور یاں سے جاتے تھے
یُوں گئے قحط کے وہ سال گزر — جیسے بچوں کی بھوک وقتِ سحر

اے دل! اے بندۂ وطن ہشیار! — خوابِ غفلت سے ہو ذرا بیدار
او شرابِ خودی کے متوالے — گھر کی چوکھٹ کے چُومنے والے
نام ہے کیا اسی کا حُبِّ وطن — جس کی تجھ کو لگی ہوئی ہے لگن
کبھی بچوں کا دھیان آتا ہے — کبھی یاروں کا غم ستاتا ہے
یاد آتا ہے اپنا شہر کبھی — تو کبھی اہلِ شہر کی ہے لگی
نقش ہیں دل پہ کوچہ و بازار — پھرتے آنکھوں میں ہیں در و دیوار
کیا وطن کی یہی محبت ہے؟ — یہ بھی اُلفت میں کوئی اُلفت ہے؟
اِس میں اِنساں سے کم نہیں ہیں درند — اِس سے خالی نہیں چرند و پرند
ٹکڑے ہوتے ہیں سنگ غربت میں — سوکھ جاتے ہیں روکھ فرقت میں

---

[1] غلّہ جمع کرنے کے مقامات۔

جا کے کابل میں آم کا پودا　　کبھی پروان چڑھ نہیں سکتا
آ کے کابل سے یاں بہی و انار　　ہو نہیں سکتے بارور زنہار
مچھلی جب چھوٹتی ہے پانی سے　　ہاتھ دھوتی ہے زندگانی سے
آگ سے جب ہوا سمندر دُور　　اس کو جینے کا پھر نہیں مقدُور
گھوڑے جب کھیت سے بچھڑتے ہیں　　جان کے لالے اُن کی پڑتے ہیں
گائے یا بھینس، اُونٹ یا بکری　　اپنے اپنے ٹھکانے خوش ہیں سبھی
کہیے حبِّ وطن اسی کو اگر　　ہم سے حیواں نہیں ہیں کچھ کمتر

ہے کوئی اپنی قوم کا ہمدرد؟　　نوعِ انساں کا جس کو سمجھیں فرد
جس پہ اطلاقِ آدمی ہو صحیح　　جس کو حیواں پہ دے سکیں ترجیح
قوم پر کوئی زد نہ دیکھ سکے　　قوم کا حالِ بد نہ دیکھ سکے
قوم سے جان تک عزیز نہ ہو　　قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو
سمجھے اُن کی خوشی کو راحتِ جاں　　واں جو نوروز ہو تو عید یہاں[1]
رنج کو اُن کے سمجھے مایۂ غم　　واں اگر سوگ ہو تو یاں ماتم
بھُول جائے سب اپنی قدرِ جلیل　　دیکھ کر بھائیوں کو خوار و ذلیل
جب پڑے اُن پہ گردشِ افلاک　　اپنی آسائشوں پہ ڈال دے خاک

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو!　　اُٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو!
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ　　ورنہ کھاؤ، پیو، چلے جاؤ
جب کوئی زندگی کا لُطف اُٹھاؤ　　دل کو دُکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ
پہنو جب کوئی عمدہ تم پوشاک　　کرو دامن سے تا گریباں چاک
کھانا کھاؤ تو جی میں تم شرماؤ　　ٹھنڈا پانی پیو تو اشک بہاؤ

---

[1] ایک نسخہ "عید ہو یاں".

کتنے بھائی تمہارے ہیں نادار
زندگی سے ہے جن کا دل بیزار

نوکروں کی تمہارے جو ہے غذا
ان کو وہ خواب میں نہیں ملتا

جس پہ تم جوتیوں سے پھرتے ہو
واں میسّر نہیں وہ اوڑھنے کو

کھاؤ تو پہلے لو خبر اُن کی
جن پہ بپتا ہے نیستی کی پڑی

پہنو تو پہلے بھائیوں کو پہناؤ
کہ ہے اُترن تمہاری جن کا بناؤ

ایک ڈالی کے سب ہیں برگ و ثمر
ہے کوئی ان میں خشک اور کوئی تر

سب کو ہے ایک اصل سے پیوند
کوئی آزردہ ہے کوئی خورسند

مقبلو! مدبروں کو یاد کرو
خوش دلو! غم زدوں کو شاد کرو

جاگنے والو! غافلوں کو جگاؤ
تیرنے والو! ڈوبتوں کو تراؤ

ہیں ملے تم کو چشم و گوش اگر
لو جو لی جائے کور و کر کی خبر

تم اگر ہاتھ پاؤں رکھتے ہو
لنگڑے لُولوں کو کچھ سہارا دو

تندرستی کا شکر کیا ہے بتاؤ؟
رنج بیمار بھائیوں کا بٹاؤ

تم اگر چاہتے ہو مُلک کی خیر
نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

ہو مسلمان اس میں یا ہندو
بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو

جعفری ہووے یا کہ ہو حنفی
جَین مت ہووے یا ہو بیشنوی

سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو
سمجھو آنکھوں کی پُتلیاں سب کو

ملک ہیں اتفاق سے آزاد
شہر ہیں اتفاق سے آباد

ہند میں اتفاق ہوتا اگر
کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر

قوم جب اتفاق کھو بیٹھی
اپنی پُونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی

ایک کا ایک ہو گیا بدخواہ
لگی غیروں کی پڑنے تم پہ نگاہ

پھر گئے بھائیوں سے جب بھائی
جو نہ آنی تھی وہ بلا آئی

پاؤں اقبال کے اُکھڑنے لگے
ملک پر سب کے ہاتھ پڑنے لگے

کبھی تورانیوں نے گھر لُوٹا
کبھی دُرّانیوں نے زر لُوٹا

کبھی نادر نے قتلِ عام کیا — کبھی محمود نے غلام کیا
سب سے آخر کو لے گئی بازی — ایک شائستہ قوم مغرب کی
یہ بھی تم پہ خدا کا تھا انعام — کہ پڑا تم کو ایسی قوم سے کام
ورنہ دم مارنے نہ پاتے تم — پڑتی جو سر پہ وہ اُٹھاتے تم
ملک روندے گئے ہیں پیروں سے — چین کس کو ملا ہے غیروں سے

قوم سے جو تمہارے ہیں برتاؤ — سوچو اے میرے پیارو اور شرماؤ
اہلِ دولت کو ہے یہ استغنا — کہ نہیں بھائیوں کی کچھ پروا
شہر میں قحط کی دوہائی ہے — جانِ عالم لبوں پہ آئی ہے
بھوک میں ہے کوئی نڈھال پڑا — موت کی مانگتا ہے کوئی دُعا
بچے اِک گھر میں بلبلاتے ہیں — رو کے ماں باپ کو رُلاتے ہیں
کوئی پھرتا ہے مانگتا در در — ہے کہیں پیٹ سے بندھا پتھر
پر جو ہیں ان میں صاحبِ مقدور — ان میں گنتی کے ہوں گے ایسے غیور
کہ جنہیں بھائیوں کا غم ہوگا — اپنی راحت کا دھیان کم ہوگا
جتنے دیکھو گے پاؤ گے بیدرد — دل کے نامرد اور نام کے مرد
عیش میں جن کے کٹتے ہیں اوقات — عید ہے دن تو شبرات ہے رات
قوم مرتی ہے بھوک سے تو مرے — کام اُنہیں اپنے حلوے مانڈے سے
ان کو اب تک خبر نہیں اصلا — شہر میں بھاؤ کیا ہے غلّے کا
غلّہ ارزاں ہے اِن دنوں کہ گراں — کال ہے شہر میں پڑا کہ سماں
کال کیا شے ہے کسکو کہتے ہیں بھوک — بھوک میں کیونکہ مرتے ہیں مفلوک
سیر بھوکے کی قدر کیا سمجھے — اس کے نزدیک سب ہیں پیٹ بھرے

اہلِ دولت کا سُن چکے تم حال — اب سنو رودادِ اہلِ کمال

فاضلوں کو ہے فاضلوں سے عناد | پنڈتوں میں پڑے ہوئے ہیں فساد
ہے طبیبوں میں نوک جھوک سدا | ایک سے ایک کا ہے تھوک جدا
رہتے دو اہلِ علم ہیں اس طرح | پہلوانوں میں لاگ ہو جس طرح
عیدو[1] والوں کا ہے اگر پٹھا | شیخو والوں میں جا نہیں سکتا
شاعروں میں بھی ہے یہی تکرار | خوشنویسوں کو ہے یہی آزار
لاکھ نیکوں کا کیوں نہ ہو اک نیک | دیکھ سکتا نہیں ہے اِک کو ایک
اس پہ طرّہ یہ ہے کہ اہلِ ہُنر | دُور سمجھے ہوئے ہیں اپنا گھر
ملی اک گانٹھ جس کو ہلدی کی | اُس نے سمجھا کہ میں ہوں پنساری
نسخہ اک طب کا جس کو آتا ہے | سگے بھائی سے وہ چھپاتا ہے
جس کو آتا ہے پھونکنا کُشتہ | ہے ہماری طرف سے وہ گونگا
جس کو ہے کچھ رمل میں معلومات | وہ نہیں کرتا سیدھے منہ سے بات
باپ بھائی ہو یا کہ ہو بیٹا | بھید پاتا نہیں منجم کا
کام کندلے[2] کا جس کو ہے معلوم | ہے زمانہ میں اس کے بخل کی دھوم
الغرض جس کے پاس ہے کچھ چیز | جان سے بھی سوا ہے اس کو عزیز
قوم پر ان کا کچھ نہیں احساں | اُن کا ہونا نہ ہونا ہے یکساں
سب کمالات اور ہُنر اُن کے | قبر میں اُن کے ساتھ جائیں گے
قوم کیا کہہ کے ان کو روئے گی | نام پر کیونکہ جان کھوئے گی
تربیت یافتہ ہیں جو یاں کے | خواہ بی اے ہوں اسمیں یا ایم اے
بھرتے حُبِّ وطن کا گو دم ہیں | پر محبِّ وطن بہت کم ہیں!
قوم کو اُن سے جو اُمیدیں تھیں | اب جو دیکھا تو سب غلط نکلیں

---

[1] عیدو والے اور شیخو والے پہلوانوں کے دو مقابل گروہ دلّی میں تھے جن میں سے ایک کے سرگروہ اور اُستاد کا نام عیدو اور دوسرے کا نام شیخو تھا۔ ۱۲ حالی

[2] تارکشی کا کام۔ فاضل۔

ہسٹری اُن کی اور جوگرافی
سات پردوں میں مُنہ دیئے ہے پڑی

بند اس قفل میں ہے علم اُن کا
جس کی کُنجی کا کچھ نہیں ہے پتا

لیتے ہیں اپنے دل ہی دل میں مزے
گویا گُونگے[1] کا گُڑ ہیں کھائے ہوئے

کرتے پھرتے ہیں سیرِ گُل تنہا
کوئی پاس اُن کے جا نہیں سکتا

اہلِ انصاف شرم کی جا ہے
گر نہیں بخل یہ تو پھر کیا ہے

تم نے دیکھا ہے جو وہ سب کو دکھاؤ
تُم نے چکھا ہے جو وہ سب کو چکھاؤ

یہ جو دولت تمہارے پاس ہے آج
ہم وطن اس کے ہیں بہت محتاج

منہ کو ایک ایک تمہارے ہے تکتا
کہ نکلتا ہے منہ سے آپ کے کیا

آپ شائستہ ہیں تو اپنے لیے
کچھ سلوک اپنی قوم سے بھی کیجیے؟

میز، کُرسی اگر لگاتے ہیں آپ
قوم سے پُوچھیے تو پُن ہے نہ پاپ[2]

مُنڈا[3] جُوتا اگر آپ کو ہے پسند
قوم کو اس سے فائدہ نہ گزند

قوم پر کرتے ہو اگر احسان
تو دکھاؤ کچھ اپنا جوشِ نہاں

کچھ دنوں عیش میں خلل ڈالو
پیٹ میں جو ہے سب اُگل ڈالو

علم کو کر دو کُو بہ کُو ارزاں
ہند کو کر دکھاؤ انگلستاں

○

سُنتے ہو سامعینِ با تمکیں!
سُنتے ہو حاضرینِ صدر نشیں!

جو ہیں دُنیا میں قوم کے ہمدرد
بندۂ قوم اُن کے ہیں زن و مرد

باپ کی ہے دُعا یہ بہرِ پسر
قوم کی مَیں بناؤں اس کو سپر

ماں خدا سے یہ مانگتی ہے مُراد
قوم پر سے نثار ہو اولاد

بھائی آپس میں کرتے ہیں پیماں
تم اگر مال دو تو مَیں دُوں جاں

اہلِ ہمت کما کے لاتے ہیں
ہم وطن فائدے اُٹھاتے ہیں

کہیں ہوتے ہیں مدرسے جاری
خیل اور خرچ جن کے ہیں بھاری

---

۱ کچھ کہنے کی قدرت نہ ہونا۔
۲ بے کار، بے فیض۔
۳ چھوٹی نوک کا جوتا جو اُن دنوں فیشن میں داخل

اور کہیں ہوتے ہیں کلب قائم — مبحثِ حکمت و ادب قائم
نت نئے کھلتے ہیں دواخانے — بنتے ہیں سیکڑوں شفاخانے
ملک میں جو مرض ہیں عالمگیر — قوم پر اُن کی فرض ہے تدبیر
ہیں سدا اس ادھیڑ بن میں طبیب — کہ کوئی نسخہ ہات آئے عجیب
قوم کو پہنچے منفعت جس سے — ملک میں پھیلیں فائدے جس سے
رسمِ بد کا اثر جہاں پایا — حملہ پر حملہ اُس پہ ہونے لگا
کہیں مجلس میں ہوتی ہے تقریر — کہیں مضمون ہوتے ہیں تحریر
ایک ناٹک بنا کے لاتا ہے — دوسرا اس کو کر دکھاتا ہے
لاکھ تدبیریں جی سے جوڑتے ہیں — آخر اس کو مٹا کے چھوڑتے ہیں
قوم کی خاطر ان کے ہیں سب کام — خواہ اس میں سفر ہو خواہ مقام
سیکڑوں گل رخ اور مہ پارے — لاڈلے ماں کے باپ کے پیارے
جان اپنی لیے ہتھیلی پر — کرتے پھرتے ہیں بحر و بر کے سفر
شوق یہ ہے کہ جان جائے تو جائے — پر کوئی بات کام کی ہات آئے
بس سے مشکل ہو کوئی قوم کی حل — ملک کا آئے کوئی کام نکل
کھپ گئے کتنے بن کے جھاڑوں میں — مر گئے سیکڑوں پہاڑوں میں
لکھے جب تک جیے سفرنامے — چل دیے ہاتھ میں قلم تھامے
گو سفر میں اُٹھائے رنج کمال — کر دیا پر وطن کو اپنے نہال
ہیں اب اُن کے گواہ حبِ وطن — در و دیوار پیرس و لنڈن
کہیے دُنیا کا جس کو باغِ جناں — ہے فرانس آج یا ہے انگلستان
کام ہیں سب بشر کے ہموطنو! — تم سے بھی ہو سکیں تو مرد بنو
چھوڑ دو افسردگی کو جوش میں آؤ — بس بہت سوئے اُٹھو ہوش میں آؤ
قافلے تم سے بڑھ گئے کوسوں — رہے جاتے ہو سب سے پیچھے کیوں
قافلوں سے اگر ملا چاہو — ملک اور قوم کا بھلا چاہو

گر رہا چاہتے ہو عزت سے — بھائیوں کو نکالو ذلت سے
ان کی عزت تمہاری عزت ہے — اُن کی ذِلت تمہاری ذلت ہے
قوم کا متبذل ہے جو انساں — بے حقیقت ہے گرچہ ہے سلطاں
قوم دنیا میں جس کی ہے ممتاز — ہے فقیری میں بھی وہ با اعزاز
عزتِ قوم چاہتے ہو اگر — جا کے پھیلاؤ ان میں علم و ہُنر
ذات کا فخر اور نسب کا غرور — اُٹھ گئے اب جہاں سے یہ دستور
اب نہ سیّد کا افتخار صحیح — نہ برہمن کو شُدر پر ترجیح
ہوئی ترکی تمام خانوں کی — کٹ گئی جڑ سے خاندانوں کی
قوم کی عزت اب ہُنر سے ہے — علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے
کوئی دن میں وہ دُور آئے گا — بے ہُنر بھیک تک نہ پائے گا
نہ رہیں گے سدا یہی دن رات — یاد رکھنا ہماری آج کی بات

گر نہیں سُنتے قول حالی کا!
پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا!

---

(۵۱)

مناظرۂ رحم و انصاف

سنہ ۱۸۷۶ء

ایک دن رحم نے انصاف سے جاکر پوچھا کیا سبب ہے کہ ترا نام ہے دنیا میں بڑا
نیکنامی سے ترے سخت تحیّر ہے ہمیں ہاں سنیں ہم بھی کہ ہے کونسی خوبی تجھ میں
دوستی سے تجھے کچھ دوستوں کی کام نہیں آنکھ میں تیری مروّت کا کہیں نام نہیں
اپنے بیگانے ہیں سب تیری نظر میں یکساں دوست کو فائدہ ہے تجھ سے نہ دشمن کو زیاں
قتل انسان ہمیشہ سے ہے عادت تیری سینکڑوں چڑھ گئے سُولی پہ بدولت تیری
جان اور مال سے نمرود کو کھویا تُو نے اور فرعون کو دریا میں ڈبویا تُو نے
فوج راون کی لڑائی میں کھپائی کس نے؟ آگ لنکا میں سوا تیرے لگائی کس نے
قید خانوں میں جہاں کے ہے بڑا غل تیرا جتنے قیدی ہیں تری جان کو دیتے ہیں دُعا
تیرے فتوے پہ کروڑوں ہوئے سر تن سے جُدا اور ترے حکم سے لاکھوں ہوئے مسکن سے جُدا
لطف ہے تیری طبیعت میں نہ کچھ جوشِ غضب تجھ کو خردوں پہ ہے شفقت نہ بزرگوں کا ادب
کانپتے آتے ہیں محفل میں تری شاہ و گدا تجھ سے تھرّاتے ہیں احباب ہوں یا ہوں اعدا
جان پہچان کا ساتھی ہے نہ انجان کا دوست یار ہندو کا ہے تو اور نہ مسلمان کا دوست
نہیں جائز ترے مذہب میں کسی کی امداد تیرے نزدیک برابر ہے غلام اور آزاد
دم میں تو صحبت دیرینہ بُھلا دیتا ہے دوستی خاک میں برسوں کی ملا دیتا ہے
طور برتاؤ کا ہے سب سے نرالا تیرا تجھ سے رُوکھا کوئی دُنیا میں نہ دیکھا نہ سُنا
ہٹ پہ تو اپنی جہاں نام خدا آجائے باپ کے ہاتھ سے بیٹے کا گلا کٹوائے
اسی کرتُوت پہ اے عدل یہ دعوے ہیں تجھے کہ بنا امن کی دنیا میں ہے قائم مجھ سے

ایک تو ہے کہ یگانوں کے ہیں دل تجھ سے فگار
ایک میں ہوں کہ نہیں غیر بھی مجھ سے بیزار

رحم ہے نام مرا لطف و کرم کام مرا
فیض ویرانہ و آباد میں ہے عام مرا

حق کی الطاف و عنایت کا بہانہ ہوں میں
خلق کی کام روائی میں یگانہ ہوں میں

میری سرکار میں ہو جاتے ہیں سب عذر قبول
میرے دربار سے جاتے نہیں مجرم بھی ملول

لطف ہے عام سدا اہلِ خطا پر میرا
ہاتھ اُٹھتا نہیں خونی کی سزا پر میرا

غم مرے سامنے شادی سے بدل جاتے ہیں
ہنستے جاتے ہیں جو یاں روتے ہوئے آتے ہیں

مجرئی شرم و مروّت مرے دربار کے ہیں
بخشش و جود ملازم مری سرکار کے ہیں

موجزن ہوتا ہے جب فیض کا میرے قلزم
یاس ہو جاتی ہے انبوہ میں اُمید کے گم

مصر میں قید سے یوسفؑ کو نکالا میں نے
اور ایوبؑ کے بیڑے کو سنبھالا میں نے

میں ہر اک درد میں ہو جاتا ہوں انساں کے شریک
میں نہ ہوتا تو نہ دیتا کوئی محتاج کو بھیک

میں ہی دیتا ہوں یتیموں کو سہارا جا کر
میں ہی لیتا ہوں بُرے حال میں رانڈوں کی خبر

میرے ہی دم سے ہے آدمؑ کا نمونہ باقی
میرے ہی دم سے ہے عالم میں نمودِ بشری

ورنہ انساں کہ ہے جرم و خطا کا پُتلا
میں نہ ہوتا تو بھلا اس کا ٹھکانا کیا تھا

بیڑا فرعون کا جب غرقِ فنا ہوتا تھا
میں وہاں ساحلِ دریا پہ کھڑا روتا تھا

تجھ سے ہوتے اگر اے عدل جہاں میں دوچار
لُٹ گئی ہوتی کبھی کی مرے گلشن کی بہار

جب سُنا رحم سے یہ ولولہ انگیز خطاب
کہا انصاف نے ہو حکم تو دوں اسکا جواب

آپ کی نیکیوں سے کس کو ہے انکار یہاں
کیونکہ ہے ذکرِ جمیل آپ کا مشہورِ جہاں

مگر اے رحم! بُرا ماننے کی بات نہیں
نیکیاں آپ کو کر دیں نہ یہ بدنام کہیں

ہم نے مانا کہ مروّت بھی بڑی ہے اک چیز
پر مروّت کے لیے شرط ہے اے دوست تمیز

کھو دیا جس نے مروّت کو یہاں عام کیا
اس کو رسوا کیا اور آپ کو بدنام کیا

بول میٹھے نہیں آفت کے یہ پرکالے ہیں
اس مروّت نے تری سینکڑوں گھر گھالے ہیں

دوستوں کو ہے اشارہ کہ کسی سے نہ ڈرو
دشمنوں سے یہ مدارا کہ جو چاہو سو کرو

چور چوری سے نہیں ڈرتے بدولت تیری
لینے پھرتی ہے اُچکّوں کو حمایت تیری

جتنے قزاق ہیں یاں ان کا مددگار ہے تُو
اور سب ڈاکوؤں کا قافلہ سالار ہے تُو

ہوا جس ملک پہ سرکار کا جاری فرمان
اس کو سمجھو کہ ہوا اب کوئی دن میں ویران

باپ کا حکم نہیں مانتے فرزندِ رشید
اور نوکر نہیں دیتے کبھی آقا کو رسید

لڑکے اُستاد کی گھُرکی کو نہیں مانتے کچھ
بدمعاش اہلِ پولیس کو نہیں گردانتے کچھ

اہلکاروں کا کچہری میں جو دیکھو بہوار[1]
سمجھو دیوانِ عدالت کو کہ ہے اِک بازار

پیٹ پکڑے ہوئے واں پھرتے ہیں حاجت والے
اور منہ کھولے ہوئے بیٹھے عدالت والے

نہیں حاکم کی مروّت سے انہیں خوفِ مآل
"بول کیا لایا ہے؟" اظہار کا پہلا ہے سوال

ہر طرف بیچ میں دلّال ہیں کچھ چھوٹ رہے
دونوں ہاتھوں سے غرضمندوں کو ہیں لوٹ رہے

یُوں تو اے رحم تری ذات میں جوہر ہیں بہت
خیر تھوڑی ہے مگر آپ میں اور شر ہیں بہت

ایک ہرن کو جو تو قید سے چھڑاتا ہے
بیسیوں قافلوں کو جان کے لُٹواتا ہے

باپ کو ہونے نہیں دیتا جو بیٹے سے خفا
بے ادب رکھنا اُسے چاہتا ہے تو گویا

مار پر اُٹھنے نہیں دیتا جو اُستاد کا ہاتھ
یہ سلوک اچھے نہیں ہیں ترے شاگرد کے ساتھ

میٹھی باتوں میں تری زہرِ ہلاہل ہے بھرا
تیرا آغاز تو اچھّا ہے پہ انجام بُرا

کاش تُو بھی مرے قانون پہ چلتا اے رحم
اپنے اندازہ سے باہر نہ نکلتا اے رحم

بے مروّت ہوں اگر میں تو یہ جوہر ہے مرا
جس کو تُو عیب سمجھتا ہے وہ زیور ہے مرا

راستبازی جو سُنی ہو وہ طبیعت ہے مری
اور عدالت جسے کہتے ہیں وہ عادت ہے مری

معتدل نام ہے جس کا وہ مزاج اپنا ہے
بھاگ اس مُلک سے جس مُلک میں راج اپنا ہے

میں ہی تھا جس نے کہ ویرانوں کو آباد کیا
میں ہی تھا جس نے کہ اخباروں کو آزاد کیا

حکم سے میرے ہوئی کونسلوں کی ماموری
ناتے سے تیری بنیں سلطنتیں جمہوری

کھو دیا میں نے نشاں سلطنتِ شخصی کا
اور دُنیا سے غلامی کو مٹا کر چھوڑا

مجلسیں سیکڑوں ملکوں میں بٹھائیں میں نے
راہیں اغلاط سے بچنے کی سُجھائیں میں نے

---

[1] بہوار: کام کاج۔ کاروبار۔

حکم و قانون کسی گھر میں مقید نہ رہا
سلطنت نام ہے اب قسم کی پنچایت کا

جس طرح ظلم کا اسے رحم روادار نہیں
میں اسی طرح سے تیرا بھی مددگار نہیں

سر ذرا جس نے اُٹھایا اُسے کھو کر چھوڑا
پاپ کی ناؤ کو دریا میں ڈبو کر چھوڑا

حکم عالم میں مرا شرق سے تا غرب ہے عام
جس نے مانا نہ مرا حکم، رہا وہ ناکام

رائے کرتی نہیں میری کسی حالت میں خطا
تیر لگتا ہے مرا جا کے نشانے پہ سدا

میں دکھا دیتا سیاست کی گر اپنی تلوار
چل نہ سکتا کبھی قابیل کا ہابیل پہ وار

کارفرما ہے جہاں میری عدالت اے رحم!
دم نہیں مارتی واں تیری مروت اے رحم

واں تعصب کا پتا اور نہ عداوت کا گزر
نہ قرابت کا نشاں اور نہ محبت کا اثر

حکم جاری ہے جدھر دیکھیے آزادی کا
بڑھ کے چلتا نہیں یاں شاہ سے لے تا بہ گدا

کجروی مکر سے کہتی ہے میں آئی تو چل
ٹیڑھے ترچھے کے بل اک آن میں جاتے ہیں نکل

پاکبازوں کو نہیں عہد میں میرے کھٹکا
جو کنوڈے[1] ہیں وہی مجھ سے کھٹکتے ہیں سدا

سات پردوں میں اگر عیب کسی کا ہے چھپا
نہ ہوا آج تو کل ہوگا مقرر رسوا

ہیں خطاکار کے دشمن در و دیوار یہاں
بھائی بھائی کے نہیں ہوتے مددگار یہاں

اور اگر عیب سے ہے پاک کسی کا دامن
غم نہیں اس کا ہو گر سارا زمانہ دشمن

نہ رعیت کا اُسے خوف نہ کچھ شاہ کا ڈر
نہ اُسے چور کا خطرہ نہ اُسے شاہ کا ڈر

نہ عدالت میں اُسے ڈر کسی فریادی کا
اور نہ کچھ دغدغہ اخباروں کی آزادی کا

جو ہنرمند ہیں دل اُنکے بڑھاتا ہوں میں
خوبیاں ان کی زمانہ میں جتاتا ہوں میں

بے ہنر ہو کسی پیرائے میں یاں جلوہ نما
عہد میں میرے ہنرمند نہیں بن سکتا

یاں نہ استاد کو شاگرد کی اصلاح سے عار
اور نہ شاگرد کو اپنی غلطی پہ اصرار

سنتے جاہل سے ہیں گر فائدہ کی بات حکیم
مستمندوں[2] کی طرح کرتے ہیں اُسکو تسلیم

نوکر آقا کی جتاتا ہے اگر کوئی خطا
بن نہیں آتا کچھ آقا سے ندامت کے سوا

---

[1] کنوڈے: عیب دار۔ فاضل

[2] مُستمند: عاجز۔ فاضل

کرنے پاتے نہیں گاہک یہ دکاں دار ستم   جنس یاں تُل نہیں سکتی کبھی مقدار سے کم
بیل بے وجہ نہیں آر کسی کی کھاتا   سُدھ سے گھوڑے پہ چابک نہیں اُٹھنے پاتا
اُونچے اُونچوں سے یہاں لیتے ہیں خدمت پوری   اور مزدوروں کو دیتے ہیں کھری مزدوری
محنتی جتنے ہیں یاں خرّم و دلشاد ہیں سب   خوار پھرتے ہیں وُہی جو کہ ہیں آرام طلب
اہلِ مقدور کو کھٹکا نہیں کچھ چوروں سے   زور مند آنکھ ملاتے نہیں کمزوروں سے
خوب کو خوب سمجھتے ہیں یہاں زشت کو زشت   ناپ سے کم نہیں لگتی کہیں تعمیر میں خشت
جھوٹے سچّوں کا نہیں بھیس بدلنے پاتے   دام بازار میں کھوٹے نہیں چلنے پاتے
جس طرف جائیے واں امن و اماں کا ہے عمل   فتنہ سرحد سے مری جاتا ہے کترا کے نکل
جس قلمرو میں کہ جاری نہیں میرا فرماں   ظلم کے ہاتھ میں واں حکم و عمل کی ہے عناں
دوست اللہ کے ہیں ٹھہرتے معتوب[1] وہاں   اور مسیحائے زماں ہوتے ہیں مصلوب وہاں
نیک فرزند ہیں ماں باپ کے جو حلقہ بگوش   رام لچھمن کی طرح پھرتے ہیں واں خانہ بدوش
مان رکھا ہے جنہیں قوم نے اولادِ رسولؐ   قوم کے ہاتھ سے ہوتے ہیں وہ پیاسے مقتول
زکریّا کی طرح جو ہیں خدا کے پیارے   اُن کے سر پہ ہیں سدا ظلم کے چلتے آرے
زہرِ سقراط سے ناصح کو پلا دیتے ہیں   اور یوسفؑ سے برادر کو دغا دیتے ہیں

گفتگو ختم یہ انصاف کی جب آ پہنچی   عقل پُرکار قضا کار وہاں جا پہنچی
واں جو دیکھا تو ہے دو بھائیوں میں کچھ تکرار   اور ہر اک کو بزرگی پہ ہے اپنی اصرار
رحم ادھر عدل سے کہتا ہے کہ تو ہے کیا چیز؟   اور ادھر رحم کو ہے عدل سمجھتا ناچیز
عقل نے دونوں کی تقریر سُنی سرتاپا   کہہ چکے وہ تو یہ سنجیدہ جواب اُن کو دیا
خیر! اک کان ہے تم جس کے ہو گوہر دونوں   ایک سے ایک ہو تم بہتر و برتر دونوں
صاف کہتی ہوں سن اے رحم نہیں اس میں خلاف   تو ہے اک قالبِ بے روح نہ ہو گر انصاف

---

[1] صحیح لفظ معاتب ہے مگر اُردو میں بجائے معاتب کے معتوب بولا جاتا ہے جیسے بجائے معفی کے معاف، پس اُردو میں یہ ہی صحیح اور فصیح ہے۔ ۱۲ حالی۔

اور سُن اے عدل نہیں اس میں تکلف سرِ مُو
گر نہ ہو رحم تو اک دیدۂ بے نور ہے تُو

دونوں تم خلق کے ہو مایۂ آرام و شکیب
گل و شبنم کی طرح ایک سے ہے اک کو زیب

سرسری فیصلہ تو یہ ہے اگر تم مانو!
اور نہیں مانتے گر بات مری تم جانو

ابھی اک نکتہ میں تم دونوں کو جتلاتی ہوں
وہ سنو غور سے میں کہتی ہوں اور جاتی ہوں

فرق اصلا نہیں تم دونوں میں لڑتے کیوں ہو
جبکہ تم ایک ہو آپس میں جھگڑتے کیوں ہو

وہی اک شے ہے کہ ہے عادل کہیں نام اس کا
کہیں مظلوم کی فریاد رسی کام اس کا

رحم کہلائے جو مظلوم کی فریاد سُنے
عدل ٹھہرے جو سزا ظالم بے رحم کو دے

وہی شفقت ہے کہ اُستاد کی ہے مار کبھی
اور ہاں باپ کی ہو جاتی ہے چمکار کبھی

وہی شفقت ہے کہ ہے گھڑکی کہیں پیار کہیں
وہی جلوہ ہے کہ ہے نُور کہیں نار کہیں

کہیں وہ حور کی صورت میں عیاں ہوتی ہے
اور کہیں قہر کے پردے میں نہاں ہوتی ہے

کہیں وہ قندِ مکرر کا مزا دیتی ہے
اور کہیں چاشنی موت چکھا دیتی ہے

یہی شفقت تھی کہ جب اُس نے سمجھا انجام
شیخ فاروق نے بیٹے کا کیا کام تمام

یہی شفقت تھی کہ جب ہو گیا بے جان پسر
ایک برچھی سی لگی باپ کے دل میں آکر

یہی شفقت ہے کہ زخمی کہیں کرواتی ہے
یہی شفقت ہے کہ پھر زخم کو بھرواتی ہے

رحم اور عدل سے جب عقل نے تقریر یہ کی
اور دی ساتھ ہی حالی نے شہادت اسکی

رہی باقی نہ فریقین کو جائے انکار
چار ناچار کیا یک جہتی کا اقرار

دیکھ کے پھر دونوں ملے ایسے کہ گویا تھے ایک
مل کے ہو جائیں کہیں جیسے کہ دو دریا ایک

(۶)

تعصب و انصاف

۱۸۸۲ء

یاد ہے ہم کو وہ عالم اپنا — جب کہ ہم آپ تھے اپنے پہ فدا
اپنی جو بات تھی خوش آتی تھی — اپنی ایک ایک ادا بھاتی تھی
اپنی ہر آن پہ ہم مرتے تھے — اپنی رعنائی کا دم بھرتے تھے
اپنے انداز کے سودائی تھے — اپنے جلوے کے تماشائی تھے
کان کو اپنی ہی بھاتی تھی الاپ — سر دھنا کرتے تھے ہم آپ ہی آپ
آپ خوبی پہ تھے اپنے مفتوں — خود ہی لیلیٰ تھے ہم اور خود مجنوں
جس جزیرے میں ہوئے تھے پیدا — اپنی لے دے کے وہی تھی دنیا
روم کی تھی نہ خبر شام کی تھی — آگہی طوس نہ بسطام کی تھی
تھے تماشائی دشت پُر خار — کبھی گلشن کی نہ دیکھی تھی بہار
پی کے شوراب ہی ہوتے تھے نہال — کہ نہ چکھا تھا کبھی آبِ زُلال[۱]
نالۂ زاغ و زغن پہ تھے فدا — نہ سنی تھی کبھی بلبل کی صدا
سیر و انگوزہ کی بو پر تھے نثار — کہ نہ برتا تھا کبھی مشکِ تتار
پرنیاں جانتے تھے کمبل کو — کہ نہ برتا تھا کبھی مخمل کو
اور ہی تھی نہ سنی بات کبھی — بدلے دیکھے تھے نہ دن رات کبھی
ہم بسر کرتے تھے جس عالم میں — واں سماں ایک تھا ہر موسم میں
رخ ہوا کا نہ بدلتا تھا کبھی — موسم آکر نہ نکلتا تھا کبھی

---

۱ زُلال: صاف اور شیریں پانی۔ فاضل

ایک ہی فصل پہ تھا دار و مدار
واں خزاں جا کے نہ آتی تھی بہار

ایک سے رہتے تھے دن رات سدا
آسماں کو تھی نہ گردش اصلا

تھی سمجھ پیر و جواں کی یکساں
عقل تھی خُرد و کلاں کی یکساں

رکھتے تھے ایک سبق از بر یاد
مبتدی، منتہی، شاگرد، اُستاد

واں نہ تھی حدِّ بلوغِ صبیاں
پیر بالغ تھے، نہ بالغ تھے جواں

نئی بولی کا وہاں صرف نہ تھا
تیس حرفوں کے سوا حرف نہ تھا

تھے خدا کے وُہی ننانوے نام
اور لینا تھا وہاں نام حرام

اہلِ دَولت کی نہ تھی عام عطا
ایک ہی سمت برستی تھی گھٹا

تھا نہ دینداروں کو غیروں سے لگاؤ
ایک ہی سمت تھا رحمت کا جھکاؤ

دعوے غیروں کے تھے سب بے صرفہ
فیصلے ہوتے تھے نت یک طرفہ

راستی کا نہ تھا غیروں پہ گماں
حق نہ دائر تھا فریقین میں واں

تھی عناصر میں نہ واں آگ نہ باد
خلق سے اک موئی مٹی تھی مراد

حس و حرکت کے کوئی پاس نہ تھا
واں کا حیوان بھی حساس نہ تھا

تھی درختوں کو نہ واں نشو و نما
چلنے پاتی تھی نہ گلشن میں ہوا

گُل شگفتہ تھے نہ پودے شاداب
واں زمانہ پہ نہ آتا تھا شباب

وہی مرغوب تھی واں پوششِ تن
جس سے آدم نے چھپایا تھا بدن

تھے پسندیدہ اُسی شان کے گھر
کی تھی حوّا نے جہاں عمر بسر

اسی انداز کے چلتے تھے جہاز
کشتیٔ نوحؑ کا جو تھا انداز

تھی اسی نسخہ پہ موقوف شفا
جو تھا بقراط نے ترتیب دیا

ٹوٹ سکتی نہ تھی واں رائے قدیم
تھا اَمِٹ لکھ گئے جو اگلے حکیم

واں کسی طرح نہ ممکن تھا خلا
واں نہ پانی تھا مرکب نہ ہوا

گھوڑے دوڑاتے تھے اگلوں نے جہاں
وہی جولاں گہِ مردم تھی وہاں

کی تھی جس جا قدما نے منزل
بڑھنے پاتے تھے نہ واں سے محمل

علم و فن تھے نئے سارے مردود — غیب کے واں تھے خزانے محدود
نئی لذت سے تھی ہر طبع نفور — نعمتیں حق کی وہاں تھیں محصور
سب کی گدی پہ لگی تھیں آنکھیں — کچھ نہ آگے نظر آتا تھا انہیں
پیچھے گر دیکھتے تھے ریگستان — سوجھتا تھا انہیں وہ آبِ رواں
آگے ہوتا تھا اگر چشمۂ آب — وہ سراسر نظر آتا تھا سراب
روشنی رکھتی تھی اُن سے اَن بن — جیسے خفاش[1] سے سورج کی کرن
تھا لکیر اپنی پہ ایک ایک فقیر — دل پہ ہر نقش تھا پتھر کی لکیر
رسم و عادت نہ بدلتی تھی وہاں — برف جم کر نہ پگھلتی تھی وہاں
آگ واں بجھ کے سلگتی کم تھی — اور سلگتی تھی تو لگتی کم تھی !
شان میں واں نہ سُنا تھا حق کی — " کُلَّ یَومٍ ھُوَ فی شان " کبھی
وضع میں تھا نہ تغیر خو میں — جائے دل سنگ تھا ہر پہلو میں
سمجھا جاتا تھا وہ دلِ بے فرماں — مُہر جس دل پہ نہ ہوتی تھی وہاں
بات مشکل تھی دلوں سے جانی — نقش تھے دل کے خطِ پیشانی
غیر کی بات خطا اپنی صواب — سب سوالوں کا تھا واں ایک جواب
بڑھ کے گر بحث کو جاتے تھے کہیں — فتح کا پہلے سے ہوتا تھا یقیں
تھی وہاں حق کی یہ ہی ڈفینیشن — منہ سے جو اپنے نکل جائے سخن
اسی عالم میں پلے تھے ہم بھی — اُنہی ساون کے تھے اندھے ہم بھی

جانتے تھے کہ جہاں میں ہم پہ — ختم ہیں سارے کمالاتِ بشر
حق نے جو ہم پہ کیے ہیں احساں — ان سے محروم ہے نوعِ انساں
سب سے ہر بات میں ہم ہیں افضل — اب نہیں کوئی ترقی کا محل !
اپنے حصہ میں ہے ساری تہذیب — خانہ پرور ہے ہماری تہذیب

---

[1] خفاش : چمگادڑ ۔

جو قدیم اپنا چلن ہے اور چال
خُردہ گیری کی نہیں اس میں مجال

ہے بری عیب سے خوراک اپنی
پاک دھبّے سے ہے پوشاک اپنی

رسم اپنی نہیں بے جا کوئی !
طور اپنا نہیں بھونڈا کوئی

آدمیت کے ہمیں ہیں مصداق
ہم سے سیکھے کوئی حُسنِ اخلاق

سب سے عالی ہیں خیالات اپنے
سب مسلّم ہیں کمالات اپنے

ہم چلے جاتے ہیں جس رستے پر
واں نہ کھٹکا ہے کہیں کا نہ خطر

تھے سمائے ہوئے جو دل میں خیال
تھا تصوّر بھی خلاف ان کے محال

جس کو اک بار بُرا جان لیا
عُمر بھر پھر اُسے اچّھا نہ کہا

ٹوٹتی تھی نہ کبھی اپنی دلیل
وہی دعوے تھا وُہی اپنی دلیل

وہم و شک کی کوئی صورت ہی نہ تھی
ہم کو تحقیق کی حاجت ہی نہ تھی

جو بدلتی تھی نہ بدلی تھی کبھی !
رائے ایسی تھی، پسند ایسی تھی

ہم سمجھتے تھے نہ سمجھانے سے
اور اُلجھ جاتے تھے سلجھانے سے

سچ وہی تھا جسے سچ جان لیا
جھوٹ تھا، جھوٹ مان لیا

حق و باطل کی تھی یہی میزان
جھوٹ اور سچ کی تھی یہی پہچان

ذاتِ باری کو نہیں جیسے زوال
رائے اپنی بھی بدلنی تھی محال

کوہ ہٹ جائے تو یہ تھا ممکن
ہم نہ ہٹتے تھے جگہ سے لیکن

حُسنِ ظن تھا یہ سمجھ پر اپنی
غلطی کا تھا گماں تک نہ کبھی

تھے لڑکپن کے خیالات تمام
دل میں اُترے ہوئے شکلِ الہام

دیکھتے سنتے تھے جو اسکے خلاف
نظر آتا تھا وہ سب لاف و گزاف

تھی نئی بات سے یاں تک نفرت
ہوتی تھی سُننے سے پہلے نفرت

تُو نئی شے کی جو پا لیتے تھے
ناک بِن دیکھے چڑھا لیتے تھے

عقل کی تھیں نہ صلاحیں مقبول
تھی وہ سرکار میں اپنی معزول

فکر پر زور نہ ڈالا تھا کبھی
ہوش ہم نے نہ سنبھالا تھا کبھی

جو کہ تھا اپنی کتابوں میں لکھا — کوئی حرف اس میں جز الہام نہ تھا
جو کہانی تھی بزرگوں سے کہی — تھا وہی فلسفہ اور علم وہی
تھا لباسوں میں لباس اپنا لباس — اور سب سوختنی بے وسواس
تھی زباں اپنی زبانِ پاکاں — ماسوا اہلِ جہنّم کی زباں
جلوۂ دہر کا باقی تھا نہ ہوش — تھے نشہ میں یہ خودی کے مدہوش
کان میں پڑتی تھی جب بات نئی — غیر ہو جاتی تھی حالت دل کی
خرق عادت بھی اگر دیکھتے تھے — آنکھ اُٹھا کر نہ ادھر دیکھتے تھے
نئی آواز سے چونک اُٹھتے تھے — اور پری شکل پہ بھونک اُٹھتے تھے
ساری دُنیا سے نرالا تھا مذاق — ہم کو تھا زہر بھی اپنا تریاق
اپنی حجت کو قوی جانتے تھے — بات ہر پھر کے وُہی مانتے تھے
تھا نہ قصدِ حق و باطل مطلق — جو پڑھا تھا وُہی از بر تھا سبق
خصم[1] سے بحث اگر کرتے تھے — حق سے ہم قطع نظر کرتے تھے
کاٹ دی خصم نے جو بات کہی — بحث و تکرار کی غایت تھی یہی
خصم کی بات کو کرنا تسلیم — اپنے نزدیک ہزیمت تھی عظیم
حق کا خطرہ جو کبھی آتا تھا — نفس آپ اپنے کو جھٹلاتا تھا
دشمنی کے یہی معنے تھے کہ جو — ہم کہیں بات وہ تسلیم نہ ہو؟
ہم اندھیرے کو اگر کہتے تھے نور — دوستوں کو یہی کہنا تھا ضرور
گر خلاف اپنے کوئی بول اُٹھا — اُس سے بڑھ کر کوئی بدخواہ نہ تھا
ذکر غیروں کا نہ تھا بے نفریں — کوئی مردود تھا اور کوئی لعیں
غیر کے واسطے تھی نارِ سعیر[2] — باغِ فردوس تھی اپنی جاگیر
اور تھے حرص و ہوا کے بندے — ہم تھے مخصوص خدا کے بندے
بخششیں ختم تھیں ساری ہم پر — وقف تھی رحمتِ باری ہم پر

---

۱ خصم: دشمن، حریف۔ ۲ سعیر: بھڑکتی آگ۔

نیک اعمال سے تھے غیروں کے تباہ اور مغفور تھے سب اپنے گناہ
عینِ تحقیق تھی اپنی تقلید شرک اپنا تھا سراسر توحید
تھا بدی کا نہ گنہ کا کچھ ڈر پاس ایسی کوئی رکھتے تھے سپر
سب دُعا گو تھے ہمارے ملکوت تھے ہمیں آدم و حوّا کے سپُوت
حوضِ کوثر پہ تھا قبضہ اپنا سلسبیل اپنی تھی طوبیٰ اپنا
اپنی ظلمت تھی سراسر تنویر اپنے اندھوں کو بھی کہتے تھے بصیر
رکھتے جنّت میں نہ تھے ہم ساجھی غیر ناری تھے سب اور ہم ناجی
تھے قضا اور قدر کے مالک ہم تھے اللہ کے گھر کے مالک
عصبیت میں رہے جب تک چُور کھینچتے یُوں ہی رہے آپ کو دُور
نظر آتا تھا نہ کچھ پست و بلند تھے ہم ایک کلبۂ تاریک میں بند

دی جب انصاف نے دستک آکر حجرۂ تنگ سے نکلے باہر
جلوۂ علم و یقیں کو دیکھا آسماں اور زمیں کو دیکھا
رُخ حقیقت نے دکھایا ہر سُو چاند تاسا نظر آیا ہر سُو
کی تعصب سے جو ہیں قطعِ نظر ہوا اِک اور ہی عالم میں گذر
علم پر تھا نہ جہاں کوئی حجاب دھوکا پانی کا نہ دیتا تھا سراب
جھوٹ سے سچ نتھر آتا تھا الگ دودھ پانی نظر آتا تھا الگ
نکتہ چیں یار تھے واں یاروں کے قدرداں غیر تھے اغیاروں کے
دُور بیگانہ نہ تھے خویش سے واں خویش اوّل تھا نہ درویش سے واں
عیب سب کہتے تھے اپنے خوش خوش دوغ واں اپنی بھی ہوتی تھی تُرش
تھی نجس کوئی نہ انساں کی زباں گاڈ بھی کہتے تھے اللہ کو واں
حق کی پہچان جز اخلاص نہ تھی حق کی پوشش کوئی واں خاص نہ تھی
ساتھ اغیار کے کھاتے تھے اگر کبھی ایماں کا نہ ہوتا تھا ضرر

صلح کا لمپ جلاتے تھے وہاں　　اتفاقاً میز پہ کھاتے تھے وہاں
نہ سمجھتا تھا وہاں کوئی بشر　　آپ کو نوعِ بشر سے بہتر
بھائی انسان تھے سب انسانوں کے　　ریت ہندو سے تھے مسلمانوں کے
ایک معدن کے تھے سب لعل و گہر　　ایک ڈالی کے تھے سب برگ و ثمر
اشعری، معتزلی، لامذہب　　اک ماں باپ کی اولاد تھے سب
اپنی ہر رائے پہ کرنا اصرار　　کفر واں بس یہی پایا تھا قرار
ہٹ سے باز آتے تھے جو زنہار　　تھے بوجہل کی اُمت میں شمار
پاؤں واں جن کے پھسل جاتے تھے　　خود پھسل کر وہ سنبھل جاتے تھے
ٹیڑھ واں دل کی نکل سکتی تھی　　رائے اپنی بھی بدل سکتی تھی
دیکھ حجت کو قوی پیر و جواں　　بند ہو جاتے تھے بحثوں کے دہاں
حق کی آواز جہاں آتی تھی　　مت کروڑوں کی بدل جاتی تھی
پاک عقلیں تھیں خطا سے نہ علوم　　جز نبیؐ کوئی نہ تھا واں معصوم
غور ہر بات میں کی جاتی تھی　　مشورت عقل سے لی جاتی تھی
تھی وہاں عقل معطل نہ حواس　　سب قویٰ کام میں تھے بے وسواس
آنکھ رہ سکتی نہ تھی بن دیکھے　　کان سننے سے نہ باز آتے تھے
سوجھتی تھی جو الگ کوئی چیز　　جا پہنچتی تھی اُسے واں چشمِ تمیز
سنتے تھے بات نرالی جس دم　　کستے تھے اس کو محک پر پیہم
کڑوے اور میٹھے کو چکھ لیتے تھے　　کھرے کھوٹے کو پرکھ لیتے تھے
پھول ہر خار سے چن لیتے تھے　　بھوگ[1] نیچوں کے بھی سن لیتے تھے
عادتیں سب کی بدلتی ہیں سدا　　ایک اللہ کی عادت کے سوا
عیب جس رسم میں پا لیتے تھے　　دل وہیں اس سے ہٹا لیتے تھے
اچھی پوشاک جو مل جاتی تھی　　ملگجے کپڑوں سے شرم آتی تھی

---

[1] بھوگ: گالی۔ کلمات بد۔

دیکھ لی جس نے کہ شمع کافور ۔۔۔ تھا وہ چیکٹ بھرے ڈبوں سے نقود
ہاتھ آجاتا تھا جب مال نیا ۔۔۔ پھینک سب دیتے تھے عطار دوا
گر کے ہو جاتے تھے گھر جن کے کھنڈر ۔۔۔ گھر کی واجب تھی مرمت اُن پر
نت نئی ریت نکلتی تھی وہاں ۔۔۔ رُت سماں روز بدلتی تھی وہاں
قافلے چلتے تھے دن رات تمام ۔۔۔ کسی منزل پہ نہ کرتے تھے مقام
قبلہ تھا علمِ الٰہی اُن کا ۔۔۔ تھا سفر لا متناہی[۱] اُن کا
تشنۂ علم تھے واں سب ایسے ۔۔۔ پیاسے پانی کے ہوں طالب جیسے
نہ مجسطی[۲] پہ قناعت تھی اُنہیں ۔۔۔ نہ اشارات کفایت تھی اُنہیں
عرش تحقیق تھا استھان اُن کا ۔۔۔ مصر تیرتھ تھا نہ یونان اُن کا
دیکھا جب عالمِ انصاف کا رنگ ۔۔۔ ہم کو خود آنے لگا آپ سے ننگ
خوبیاں اپنی تھیں جو ذہن نشیں ۔۔۔ اُن پہ ہم کرنے لگے خود نفریں
عیب سب اپنے نظر آنے لگے ۔۔۔ آپ ہم اپنے سے شرمانے لگے
ہوئی وہ بزم خیالی برہم ۔۔۔ تھا طلسمات کا گویا عالم
جس کو سمجھے تھے غلط ہم دریا ۔۔۔ اک وہ ناپید سا قطرہ نکلا
تھا جس کو یقین چشمۂ آب ۔۔۔ وہ نمائش تھی حقیقت میں سراب
قصر و ایوان کا گماں تھا جن پر ۔۔۔ نکلے آخر وہ گڑھے اور کھنڈر
تھا سبک دانۂ خردل کے سوا ۔۔۔ کوہِ الوند[۳] جسے سمجھا تھا
جب ہر ایک قوم کا ساماں دیکھا ۔۔۔ ہم نے واں آپ کو عریاں دیکھا
نکلے سب ہیچ خیالات اپنے ۔۔۔ ٹھہرے سب پوچ کمالات اپنے
آپ کو اونٹ سمجھتا تھا بڑا ۔۔۔ نکلا جب تک کسی گھاٹی سے نہ تھا
چوٹیاں آئیں جو پربت کی نظر ۔۔۔ پھر اُٹھایا نہ کبھی اُونٹ نے سر

---

۱ لا متناہی : نہ ختم ہونے والا۔

۲ مجسطی : اشارات : دو کتابوں کے نام

۳ اَلوَند : ایران کا ایک پہاڑ۔

جُھنگا جب تک رہا گولر میں نہاں   تھا وہی اُس کے تصور میں جہاں
پر وہ گولر سے جو باہر آیا   اپنی ہستی سے بہت شرمایا
پردہ جب تک رہا آنکھوں پہ پڑا   حسن پر اپنے گماں تھے کیا کیا
منہ جب آئینہ میں دیکھا جاکر   ہم کو اک شکل مہیب آئی نظر
ہوگیا حیرت سے دگرگوں احوال   ڈر گئے دیکھ کے اپنے خط و خال
دیکھا جب آپ کو بالکل معیوب   چھپ گئے غیروں کی آنکھوں سے عیوب
یک قلم ہو گئی نخوت کافور   بن گیا رشک ہمارا وہ غرور
ناخنِ فکر نے کی دل میں خراش   عیب جُویوں کی لگے کرنے تلاش
جن کے طعنوں کی تھی ہم پر بھرمار   اُن کے ہم دل سے ہوئے شکر گزار
ہم نے جانا کہ یہی ہیں دل سوز   چل رہے تیر ہیں جن کے دلدوز
اُن کا غصہ ہے سراسر رحمت   زہر میں اُن کے بھرا ہے امرت
اُنہیں بندوں کے ہیں ایماں سچے   یہی کافر ہیں مسلماں سچے
قائم انصاف کا جب ہوگا نشاں   مانتے جائیں گے اُنہیں کے احساں
بے خبر کب کے پڑے سوتے تھے   اُن کی آواز سے ہم چونک اُٹھے
اُن کے طعنوں نے جگایا ہم کو   زہر نے اُن کے جلایا ہم کو
یار اور اغیار کے عیب اور ہنر   آشکارا ہوئے ایک اک ہم پر
حق کے جلوے نظر آئے ہر جا   اہلِ باطل میں بھی اک پائی ادا
نہ ملا راہ میں باطل کا سُراغ   اہلِ حق کو بھی نہ پایا بے داغ
اہلِ تقویٰ کی ریائیں دیکھیں   اہلِ حکمت کی خطائیں دیکھیں
زشتیاں دیکھیں نکوکاروں میں   خُوبیاں پائیں گنہگاروں میں
کلب کی پاک سرشتی دیکھی   پائے طاؤس کی زشتی دیکھی
عیب بھی دیکھے ہنر بھی دیکھے   خار بھی دیکھے ثمر بھی دیکھے
ہنر اغیار میں پائے اکثر   عیب اپنے نظر آئے اکثر

دفترِ علم کو ابتر پایا — علم کو جہل سے بدتر پایا
مجلسیں غیبت و بہتان سے پُر — صحبتیں جھوٹ سے طوفان سے پُر
منقطع بھائی کی بھائی سے اُمید — اپنا بیگانہ، لہو سب کے سفید
پاک بندوں کی زباں پر دُشنام — نہ ثِقات اِس سے بری اور نہ کرام
فقرا مکر و ریا کے پُتلے — اَغنیا حرص و ہوا کے پُتلے
شیخ عیّار تو زاہد پُر فن — مولوی عقل کے سارے دُشمن
پیاز کی طرح نرے پوست ہی پوست — قوم کے دوست مگر ناداں دوست
حالت القصّہ جو دیکھی اپنی — کوئی کل سیدھی نہ پائی اپنی
سارے آوے کو ٹٹولا جا کر — کوئی برتن نہ سڈول آیا نظر
پایا اِک دین کا محکم قانون — وہ بھی یاروں کی بدولت مطعون
دیکھی آنکھوں سے جو یہ حالت زار — جی بھر آیا نہ رہا صبر و قرار
گو نہ تھا تلخ نوائی کا محل — آہیں دو چار گئیں دل سے نکل

تلخ گذرے جو کسی کو یہ صدا
حق میں تلخی کے سوا اور ہے کیا؟!

(۷)

کلمۃ الحق

۱۸۸۳ء

اے راست گوئی کیا قہر ہے تُو — اے حق کی تلخی کیا زہر ہے تُو
شے کوئی تجھ سے کڑوی نہ ہوگی — حنظل[۱] میں ایسی تلخی نہ ہوگی
ہے ناگواری پہچان تیری — "الحقُّ مُرٌّ" ہے شان تیری
یاروں کو کرتی اغیار تُو ہے — چلواتی گھر گھر تلوار تُو ہے
رشتے ہزاروں تُو نے تڑائے — باپوں سے بیٹے تُو نے چھڑائے
سقراط کو زہر تُو نے دلایا — شبیر[۲] کو قتل تُو نے کرایا
بے جرم مسموم تُو نے کرائے — سُولی پہ معصوم تُو نے چڑھائے
رخنے عرب میں تو نے نکالے — بدر و اُحد میں رن تُو نے ڈالے
موسیٰ کو مدین تُو نے بھگایا! — احمدؐ سے مکہ تُو نے چھڑایا
تُو نے صلے میں بخشے ہیں اکثر — سُولی کے اورنگ، کانٹوں کے افسر
مظلوم کتنے تیرے سہارے — "ایلی ہی ایلی" کہتے سدھارے
خونخوار لشکر ہیں ساتھ تیرے — رنگیں لہو میں ہیں ہاتھ تیرے
تیری جلو میں رسوائیاں ہیں — سنگت میں تیری تنہائیاں ہیں
تدبیر ہے تُو ناکامیوں کی! — تقریب[۳] ہے تو بدنامیوں کی
تُو آشتی کی رہتی ہے دشمن — تو مصلحت سے رکھتی ہے اَن بَن

---

۱ حنظل: ایلوا - ایک تلخ پودا اور اس کا پھل۔ قاضل، ۳ تقریب: بہانہ، تمہید۔

قطع و برش ہے تاثیر تیری   رہتی ہے ننگی شمشیر تیری
ہوتی ہے جس جا تو جلوہ گستر   دفتر بہت سے ہوتے ہیں ابتر
پڑتی ہے ہلچل ہر مرحلے میں   آتی ہے دُنیا اِک زلزلے میں
حق معبدوں میں ہوتا ہے داخل   ہوتے ہیں چھُٹے معبُودِ باطل
اُٹھتا ہے عملہ لات اور صفا کا   ہوتا ہے گھر پر قبضہ خُدا کا
عبرانیوں کا اُڑتا ہے پرچم   صف قبطیوں کی ہوتی ہے برہم
ہوتے ہیں اغیار احمدؐ کے ساتھی   بوجہل کے سب چھٹتے ہیں ناتی

اے راست گوئی اے تیغِ بُرّاں   تیرا مخالف کیوں ہو نہ ذوراں
سب وحشت آگیں مضموں ہیں تیرے   نت مصلحت پر شب خوں ہیں تیرے
گن تیرے جن پر ظاہر ہوئے ہیں   وہ تیری دُھن میں آخر ہوئے ہیں
اُمڈا جہاں سے سیلاب تیرا   پھر واں نہ کشتی ٹھہری نہ بیڑا
اُٹھتی ہیں دل سے جب تیری موجیں   ہوتی ہیں نازل واں حق کی فوجیں
دیتی ہے ہمت ان کو سہارے   کرتی ہے اُمید پنہاں اشارے
عزم اُن کی مشکل کرتا ہے آساں   دل اُن سے لاکھوں کرتا ہے پیماں
چھا جائے ظلمت گو بحر و بر میں   ہے روزِ روشن اُن کی نظر میں
زور اُن پہ تیرے ہیں آشکارا   مٹھی میں اُن کے عالم ہے سارا
عظمت جہاں ہے تیری سمائی   پربت وہاں ہیں نظروں میں رائی
شاہوں سے گردن جھکتی نہیں واں   طوفاں پہ کشتی رُکتی نہیں یاں
اے راست گوئی! تُو ہے وہ افسوں   منکر بھی دل سے ہیں جس پہ مفتوں
تلخی میں تیری طُرفہ مزا ہے   ہر دل میں چبھتی تیری ادا ہے
تُو نے جہاں دی آواز جا کر   لاکھوں اُٹھے سر تیری صدا پر
ہوتی ہے دھیمی پرواز تیری   بڑھتی ہے کم کم آواز تیری

پھر دوڑتی ہے یوں مرد و زن میں
جس طرح آتش لگتی ہے بن میں

بنتے ہیں دشمن انصار تیرے
ہوتے ہیں قیدی احرار تیرے

پطرس نے چھوڑے یار آشنا سب
یہ دن پہ دیکھی تیری ادا جب

ڈالا عمرؓ پر جب تو نے سایہ
ارقم کے گھر میں آ سر جھکایا

آہٹ سے تیری کرتے ہیں جو رم
ہیں گدگداتے دل ان کے ہر دم

جوں جوں وہ زد سے کرتے ہیں دوری
ضرب ان پہ تیری پڑتی ہے پوری

جاتا ہے آخر جب چوٹ کھا کر
گرتا ہے آخر کچھ دور جا کر

تجھ سے بھی جو ہیں وحشی بدکتے
پھر پھر کے تجھ کو جاتے ہیں تکتے

گو حق کی تلخی پائے ہوئے ہیں
پر چوٹ دل پر کھائے ہوئے ہیں

کھائے ہیں کھا کر زخم نہاں وہ
جائیں گے بچ کر تجھ سے کہاں وہ

دل دوز ہیں سب تیری ادائیں
کڑوی ہیں تیری ساری دوائیں

زہر ہلاہل برسوں پئیں جب
بیمار تیرے پائیں شفا تب

دیتی ہے اوّل تو زخم کاری
مرہم کی آخر آتی ہے باری

کل ہے مسرت، ہے آج غم تو
دیتی ہے امرت کہتی ہے سم تو

ہوتی ہے سچ سے جب سب کو نفرت
تو جھوٹ پر دان کرتی ہے لعنت

جس جا تعصّب ہے عین ایماں
انصاف کا غل کرتی ہے تو واں

رسم سلف پر مرتے جہاں ہیں
رسموں پہ حملے تیرے وہاں ہیں

تقلید جس جا ہے طوقِ گردن
تقلیدیوں سے ہے تیری اَن بن

کرتی ہے واں تو واعظ کو رسوا
ہے وحیِ مُنزَل قول اس کا جس جا

واں مفتیوں پر ہیں تیرے دھاوے
ہیں مثلِ قرآں جس جا فتاوے

پجتی ہیں قبریں جب اولیا کی
تو ہے دُہائی دیتی خدا کی

جس مُلک میں ہے تیری غلامی
ہوتی ہے تو واں بردوں کی حامی

غُل بھیڑیوں کا پڑتا جہاں ہے
تو بکریوں کی واں پاسباں ہے

زہر اس عسل کو تو ہے بناتی | جس میں حلاوت ہے سب کو آتی
اس نیش میں تو کہتی شفا ہے | نیش اجل کا جس میں مزا ہے
ہندی میں تیری تازیؔ کی بو ہے | مشرق میں کہتی مغرب کی تو ہے
جس سرزمیں میں پانی ہے عنقا | تو چھیڑتی ہے واں ذکرِ دریا
ہر سُو جہاں ہے طغیان باراں | شدۃ العطش کا کرتی ہے تو واں
سانپوں کا خطرہ پاتی جہاں ہے | اندھوں کے آگے کرتی فغاں ہے
طوفاں کی حالت پہلے سے پاکر | بیڑوں میں چرچا کرتی ہے جاکر
ڈاکے کی آمد ڈاکے سے پہلے | کہتی ہے جاکر تو کارواں سے
بلبل ہے گل پر جب چہچہاتی | اُس دم خزاں سے تو ہے ڈراتی
پاتی ہے گھر میں جب کچھ دھواں تو | آگ آگ کا غل کرتی ہے واں تو
جب دیکھتی ہے تیوریں بگڑتی | ہے آگ میں تو قوموں کی پڑتی
کرتی ہے ظاہر ان کی خطائیں | دیتی ہے ان کو بیہودہ رائیں
گر منعموں پر تو ہے برستی! | گر جھاڑتی ہے مفلس کی مستی
دیتی ہے طعنے بے غیرتوں کو | کرتی ہے رُسوا بے عصمتوں کو
للکارتی ہے تو کاہلوں کو | پھٹکارتی ہے تو جاہلوں کو
جھڑکی ہے تیری عادت میں داخل | ترشی ہے تیری طینت میں داخل
بگڑے ہیں تجھ سے دل بے نہایت | لاکھوں سنے کی ہے تیری شکایت
یاں نام تیرا جس نے لیا ہے | عالم کو اپنا دشمن کیا ہے
احکام تیرے ٹلتے رہے ہیں | تیرے نوشتے چلتے رہے ہیں
پہنچایا جس نے پیغام تیرا | جمہور میں وہ بدنام ٹھہرا
کتنوں نے مانا ساحر نبیؐ کو | کتنوں نے جانا کافر علیؓ کو
طوفاں اُٹھائے اہلِ ہدیٰ پر | بہتان باندھے زین[1] العبا پر

---

[1] زین العابدین، زین العباد، امام چہارم: علی بن حسین علیہما السلام۔

نعمانؒ کو دی بدعت سے نسبت   کی شافعیؒ پر برپا قیامت
مالکؓ پہ لائے آفت جفا جُو   یہاں تک کہ اُکھڑا مفصل[52] سے بازو
کی ابنِ حنبلؒ کی یہ مُدارا   چہرے پہ تھُوکا کوڑوں سے مارا
نکلے ائمہ اکثر وطن سے   خالی ہوا رے ابنِ حسنؓ سے
کتنوں کی باندھیں ذلت سے مشکیں   کتنوں کے رسّی ڈالی گلے میں
مُرتد بنایا اہلِ یقیں کو !   ٹھہرایا زندیق اربابِ دیں کو

اے کلمۂ حق ! تیری بدولت   مردوں پہ گزری کیا کیا مصیبت
ٹھہرے جہاں میں بیگانے سب سے   تجھ پر ہوئے دیوانے جب سے
دنیا نے اُن پہ گو ظلم توڑا   دامن اُنہوں نے تیرا نہ چھوڑا
ہے تلخ شیریں ہر بات تیری   سُننے میں کڑوی کہنے میں میٹھی
کانوں کو تو ہے گرتا گوارا   منہ سے نکلنا تیرا ہے پیارا
جو حرفِ حق سے بھاگے بگڑ کر   حق اُن کو لایا گردن پکڑ کر
حق کے سب آخر طالب ہوئے ہیں   نت حق کے دعوے غالب ہوئے ہیں
ہوتا نہ ہرگز جگ میں اُجالا   حق کا نہ ہوتا گر بول بالا

اے راست گوئی اے ابرِ رحمت   ہے اس چمن میں سب تیری برکت
گر تُو نہ ہوتی یاں سایہ افگن   برباد ہوتا کب کا یہ گلشن !
عالم ہے سرسبز تیرے قدم سے   آباد یہ گھر ہے تیرے دم سے
باغِ جہاں کو چھانٹا ہے تُو نے   اکثر خزاں کو ڈانٹا ہے تُو نے
تُو بے کسوں کی یاور رہی ہے   تُو گمرہوں کی رہبر رہی ہے
جن بستیوں میں تو چھائی   کھیتی اُنہی کی یہاں لہلہائی

---

۵۲ مِفصل : جوڑ، بند۔

بند اپنی جس جا تو نے زباں کی — نکہت نئے منزل آکر وہاں کی
رہبر نہ ہوتا گر نور تیرا — یونان میں ہوتا ہر سُو اندھیرا
گر مصر کی تو کھوتی نہ خامی — مصری نہ ہوتے عالم میں نامی
سرّا میں حق کا جھنڈا نہ گڑتا — سایہ اگر وہاں تیرا نہ پڑتا
جنبش نہ ہوتی گر تیرے لب کو — قبلہ نہ کرتے خاکِ عرب کو
ہوتے رہے ہیں سب ملک و ملّت — سرسبز تجھ سے نوبت بہ نوبت
مشرق میں جب تھی تیری حکومت — چھائی ہوئی تھی مغرب میں ظلمت
جب دَور تیرا مغرب میں آیا — مغرب کو تو نے مشرق بنایا
کھلتے رہے ہیں گُل تیرے ہر سُو — مہکی ہے اکثر یاں تیری خوشبو
گو تجھ میں تلخی حد سے سوا ہے — پر تیری دارو صحت فزا ہے
ہر بول تیرا جوشِ غضب میں — ہے حق کی آواز راہِ طلب میں
گو عِلم کی ہے تو زندگانی ! — پہ جہل تیرا دشمن ہے جانی
جاہل ہمیشہ تجھ سے لڑے ہیں — ناداں ہزاروں تجھ سے اڑے ہیں
لاکھوں بلائیں آئی ہیں تجھ پر — اکثر گھٹائیں چھائی ہیں تجھ پر
ملکوں نے تجھ پر حملے کیے ہیں — قوموں نے تجھ سے بدلے لیے ہیں

اے کلمۂ حق ! اے سرِ یزداں — جس وقت ہو تُو پردہ سے عُریاں
ہوں تیرے جس دم انصار تھوڑے — دشمن بہت ہوں اور یار تھوڑے

عالم ہو تیرا جب ناشناسا
حالیؔ کو رکھیو اپنا شناسا

---

(۸)

بیوہ کی مناجات

سنہ ۱۸۸۴ء

اے سب سے اوّل اور آخر — جہاں تہاں حاضر اور ناظر
اے سب داناؤں سے دانا — سارے تواناؤں سے توانا
اے بالا ہر بالا تر سے — چاند سے سورج سے امبر سے
اے سمجھے بُوجھے بن سوجھے — جانے پہچانے بن بُوجھے
سب سے انوکھے سب سے نرالے — آنکھ سے اوجھل دل کے اجالے
اے اندھوں کی آنکھ کے تارے — اے لنگڑے لُولوں کے سہارے
ناتیوں سے چھوٹوں کے ناتی — ساتھیوں سے بچھڑوں کے ساتھی
ناؤ جہاں کی کھینے والے — دُکھ میں تسلّی دینے والے
جب اب تجھ سا نہیں کوئی — تجھ سے ہیں سب تجھ سا نہیں کوئی
جوت ہے تیری جل اور تھل میں — باس ہے تیری پھول اور پھل میں
ہر دل میں ہے تیرا بسیرا — تو پاس اور گھر دُور ہے تیرا
راہ تری دشوار اور سکڑی — نام ترا رہگیر کی لکڑی
تُو ہے ٹھکانا مسکینوں کا — تُو ہے سہارا غمگینوں کا
تُو ہے اکیلوں کا رکھوالا — تُو ہے اندھیرے گھر کا اُجالا
لاگو اچھے اور بُرے کا — خواہاں کھوٹے اور کھرے کا
بیدؔ، نراسے بیماروں کا — گاہک مندے بازاروں کا

سوچ میں دل بہلانے والا
بپتا میں یاد آنے والا

اے بے وارث گھروں کے وارث — بے بازو بے پروں کے وارث
بے آسوں کی آس تُو ہی ہے — جاگتے سوتے پاس تُو ہی ہے
بس والے ہیں یا بے بس ہیں — تُو نہیں جن کا وہ بے کس ہیں
ساتھی جن کا دھیان ہے تیرا — دُوسرایت کی واں نہیں پروا
دل میں ہے جن کے تیری بڑائی — گنتے ہیں وہ پربت کو رائی
بے کس کا غم خوار ہے تُو ہی — بُری بنی کا یار ہے تُو ہی
دُکھیا، دُکھی، یتیم اور بیوہ — تیرے ہی ہاتھ ان سب کا ہے کھیوا
تُو ہی ڈبوئے، تُو ہی ترائے — تُو ہی یہ بیڑے پار لگائے
تُو ہی مرض دے تُو ہی دوا دے — تُو ہی دوا دارُو میں شفا دے
تُو ہی پلائے زہر کے پیالے — تُو ہی پھر امرت زہر میں ڈالے
تُو ہی دلوں میں آگ لگائے — تُو ہی دلوں کی لگی بجھائے
چمکارے چمکار کے مارے — مارے مار کے پھر چمکارے

پیار کے تیرے پُوچھنا کیا ہے
مار میں بھی اک تیرے مزا ہے

اے رحمت اور ہیبت والے — شفقت اور دباغت والے
اے اٹکل اور دھیان سے باہر — جان سے اور پہچان سے باہر
عقل سے کوئی پا نہیں سکتا — بھید ترے حکموں میں ہیں کیا کیا
ایک کو تُو نے شاد کیا ہے — ایک کے دل کو داغ دیا ہے
اُس سے نہ تیرا پیار کچھ ایسا — اِس سے نہ تُو بیزار کچھ ایسا
ہر دم تیری آن نئی ہے — جب دیکھو تب شان نئی ہے
یاں پچھوا ہے واں پُروا ہے — گھر گھر تیرا حکم نیا ہے

پھول کہیں کمھلائے ہوئے ہیں — اور کہیں پھل آئے ہوئے ہیں
کھیتی ایک کی ہے لہراتی — ایک کا ہر دم خون سُکھاتی
ایک پڑے ہیں دھن کو ڈبوئے — ایک ہیں گھوڑے بیچ کے سوئے
ایک نے جب سے ہوش سنبھالا — رنج سے اُس کو پڑا نہ پالا
ایک نے اس جنجال میں آ کر — چین نہ دیکھا آنکھ اُٹھا کر
مینہ کہیں دولت کا ہے برستا — ہے کوئی پانی تک کو ترستا
ایک کو مرنے تک نہیں دیتے — ایک اُکتا گیا لیتے دیتے
حال غرض دُنیا کا یہی ہے — غم پہلے اور بعد خوشی ہے
رنج کا ہے دُنیا کے گِلا کیا — ٹھہری ہی لے دے کے یہاں کا
یاں نہیں بنتی رنج سہے بِن — رنج نہیں سب ایک سے لیکن
ایک سے یہاں رنج ایک ہے بالا — ایک سے ہے درد ایک نرالا
گھاؤ ہے گو ناسُور کی صُورت — بڑا ہے کیا ناسور سے نسبت
تپ بھی ہی دق کی شکل ہے لیکن — دِق نہیں رہتی جان لیے بِن
دِق ہو وہ یا ناسُور ہو کچھ ہو — دے نہ جو اَب اُمید کسی کو
روزہ کا غم کیونکر سہے کوئی — آس نہ جب باقی رہے کوئی
تُو ہی کر انصاف اے میرے مولا! — کون ہے جو بے آس ہے جیتا
گو کہ بہت بنارے ہیں پُرارماں — کم ہیں مگر مایوس ہیں جو یاں
خواہ دُکھی ہے خواہ سُکھی ہے — جو ہے اِک اُمید اُس کو بندھی ہے
کھیتیاں جن کی کھڑی ہیں سُوکھی — آس وہ باندھے بیٹھے ہیں مینہ کی
گھاٹا جن کو اساڑھی میں ہے — ساونی کی اُمید اُنہیں ہے
ڈوب چکی ہے جن کی اگیتی — دیتی ہے ڈھارس اُن کو پچھیتی
ایک ہے اس اُمید پہ جیتا — اب ہوئی بیٹی اب ہوا بیٹا
ایک کو جو اولاد ملی ہے — اس کو امنگ اب شادی کی ہے

رنج ہے یا قسمت میں خوشی ہے — کچھ ہے مگر اک آس بندھی ہے
غم نہیں اُن کو، گو غمگیں ہیں — جو دل نا اُمید نہیں ہیں
کال میں کچھ سختی نہیں ایسی — کال میں ہے جب آس سمین[1] کی
سہل ہے موجوں سے چھٹکارا — جبکہ نظر آتا ہے کنارا
پر نہیں اُٹھ سکتی وہ مصیبت — آئے گی جس کے بعد نہ راحت
شاد ہو اِس رہگیر کا کیا دل — مر کے کٹے گی جس کی منزل
اُن اُجڑوں کو کَل پڑے کیونکر — گھر نہ بسے گا جن کا جنم بھر
اُن بچھڑوں کا کیا ہے ٹھکانا — جن کو نہ ملنے دے گا زمانا
اب یہ بلا ٹلتی نہیں ٹالی — مجھ پہ ہے جو تقدیر نے ڈالی
آئیں بہت دُنیا میں بہاریں — عیش کی گھر گھر پڑیں پکاریں
پڑے ہیں بہت باغوں میں جھولے — ڈھاک بہت جنگل میں پھولے
گئیں اور آئیں چاندنی راتیں — برسیں کھلیں بہت برساتیں
پر نہ کھلی ہرگز نہ کھلے گی — وہ جو کلی مُرجھائی تھی دل کی
آس ہی کا یہاں نام ہے دُنیا — جب نہ رہی یہ ہی تو رہا کیا
ایسے بدیسی کا نہیں غم کچھ — جس کو نہ ہو ملنے کی قسم کچھ
رونا ان بن باسیوں کا ہے — دیس نکالا جن کو ملا ہے
حکم سے تیرے پر نہیں چارا — کڑوی میٹھی سب ہے گوارا
زور ہے کیا پتے کا ہوا پر — چاہے جدھر لے جائے اُڑا کر
تنکا اِک اور سات سمندر — جائے کہاں موجوں سے نکلکر
قسمت ہی میں جب تھی جُدائی — پھر ٹلتی کس طرح یہ آئی
آج کی بگڑی ہو تو بنے بھی — ازل کی بگڑی خاک بنے گی
تو جو چاہے وہ نہیں ٹلتا — بندے کا یاں بس نہیں چلتا
مارے تو اور نہ دے تو رونے — تھپکے اور نہ دے تو سونے

---

[1] خوشحالی - اچھا موسم۔

ٹھہرے بن آتی ہے نہ ٹھلگے تیری زبردستی کے آگے
تجھ سے کہیں گر بھاگنا چاہیں بند ہیں چاروں کھونٹ کی راہیں
تو مارے اور خواہ نوازے پڑی ہوں میں تیرے دروازے
تجھی کو اپنا جانتی ہوں میں تجھ سے نہیں تو کس سے کہوں میں

ماں ہی سدا اپنے بچے کو مارے
اور بچہ ماں ماں ہی پکارے

اے مرے زور اور قدرت والے حکمت اور حکومت والے
میں لونڈی تیری دکھیاری دروازے کی تیری بھکاری
موت کی خواہاں جان کی دشمن جان پہ اپنی آپ اجیرن
اپنے پرائے کی دھتکاری میکے اور سسرال پہ بھاری
سہہ کے بہت آزار چلی ہوں دنیا سے بیزار چلی ہوں
دل پر میرے داغ ہیں جتنے منہ میں بول نہیں ہیں اتنے
دکھ دل کا کچھ کہہ نہیں سکتی اس کے سوا کچھ کہہ نہیں سکتی
تجھ پہ ہے روشن سب دکھ دل کا تجھ سے حقیقت اپنی کہوں کیا
بیاہ کے دم پائی تھی نہ لینے لینے کے یاں پڑ گئے دینے
خوشی میں بھی سکھ پاس نہ آیا غم کے سوا کچھ راس نہ آیا
ایک خوشی نے غم یہ دکھلائے ایک ہنسی نے گل یہ کھلائے
کیسا تھا یہ بیاہ نناواں[1] جونہی پڑا اس کا پرچھاواں
چین سے رہنے دیا نہ جی کو کر دیا ملیا میٹ خوشی کو
رہ نہیں سکتی تنگ ہوں یہاں تک اور روؤں تو روؤں کہاں تک
ہنس ہنس دل بہلاؤں کیونکر اوسوں پیاس بجھاؤں کیونکر
ایک کا کچھ جینا نہیں ہوتا ایک نہ ہنستا بھلا نہ روتا

---

[1] وہ چیز جس کا نام لینا بدشگونی ہو۔ فاضل

لیٹیے گر سونے کے بہانے ‏ ‏ پائنتی کل ہے اور نہ سرہانے
جاگیے تو بھی بن نہیں پڑتی ‏ ‏ جاگنے کی آخر کوئی حد بھی
اب کل ہم کو پکڑے گی مرکر ‏ ‏ گور ہے سونی سیج سے بہتر[1]
بات سے نفرت کام سے وحشت ‏ ‏ ٹوٹی آس اور بجھی طبیعت
آبادی جنگل کا نمونا ‏ ‏ دنیا سونی اور گھر سونا
دن بھیانک رات ڈراونی ‏ ‏ یوں گزری ساری یہ جوانی
بہنیں اور سہیلیاں میری ‏ ‏ ساتھ کی تھیں جو کھیلیاں میری
مل نہ سکیں جی کھول کے مجھ سے ‏ ‏ خوش نہ ہوئیں ہنس بول کے مجھ سے
جب آئیں رو دھو کے گئیں وہ ‏ ‏ جب گئیں بیکل ہو کے گئیں وہ
کوئی نہیں دل کا بہلاوا ‏ ‏ آ نہیں چکتا میرا بلاوا[2]
آٹھ پہر کا ہے یہ جلاپا ‏ ‏ کاٹوں گی کس طرح رنڈاپا
تھک گئی میں دکھ سہتے سہتے ‏ ‏ تھم گئے آنسو بہتے بہتے
آگ کھلی دل کی نہ کسی پر ‏ ‏ گھل گئی جان اندر ہی اندر
دیکھ کے چپ جانا نہ کسی نے ‏ ‏ جان کو پھونکا دل کی لگی نے
دبی تھی بھوبھل میں چنگاری ‏ ‏ لی نہ کسی نے خبر ہماری
قوم میں وہ خوشیاں بیاہوں کی ‏ ‏ شہر میں وہ دھومیں ساہوں[3] کی
تہواروں کا آئے دن آنا ‏ ‏ اور سب کا تہوار منانا
وہ چیت اور پھاگن کی ہوائیں ‏ ‏ وہ ساون بھادوں کی گھٹائیں
وہ گرمی کی چاندنی راتیں ‏ ‏ وہ ارمان بھری برساتیں
کس سے کہوں کس طور سے کاٹیں ‏ ‏ خیر کٹیں جس طور سے کاٹیں
چاؤ کے اور خوشیوں کے ہیں سب ‏ ‏ آتے ہیں خوش کل جان کو ہے جب

---

[1] بعض نسخوں میں بہتر کی بجائے بڑھ کر ہے۔ [2] بلاوا آنا: موت آنا۔ فاضل

[3] ساہن: شادیوں۔ ساہا: بیاہ۔ شادیوں کا زمانہ۔ ہندوؤں کا روزمرہ۔ فاضل

رنج میں ہیں سامان خوشی کے　　اور جلانے والے جی کے
گھر برکھا اور پیا بدیسی　　آئی تو برکھا کہیں نہ ایسی
دن یہ جوانی کے کٹے ایسے　　باغ میں پنچھی قید ہوں جیسے
رُت گئی ساری سر ٹکراتے　　اُڑ نہ سکے پھر ہوتے ساتے
ہو گی کسی نے کچھ کل پائی　　مجھ کو تو شادی راس نہ آئی
آس بندھی لیکن نہ ملا کچھ　　پھول آیا اور پھل نہ لگا کچھ
رہ گیا دے کر چاند دکھائی　　چاند ہوا پر عید نہ آئی
رُت بدلی پر ہوئی نہ برکھا　　بادل گرجا اور نہ برسا
پھل کی خاطر برچھی کھائی　　پھل نہ ملا اور جان گنوائی
ریت میں ذرّے دیکھ چمکتے　　دوڑ پڑی میں جھیل سمجھ کے

چاروں کھونٹ نظر دوڑائی
پر پانی کی بوند نہ پائی

اے دین و دُنیا کے مالک　　راجا اور پرجا کے مالک
بے پر اور بے پردار کے والی　　اے سارے سنسار کے والی
پورب، پچھم، دکھن، اُتر　　بخشش تیری عام ہے گھر گھر
پیاؤ لگی ہے سب کے لیے یاں　　خواہ ہوں ہندو خواہ مسلماں
ہو نہ اگر قسمت نے کمی کی　　کی نہیں بندی تو نے کسی کی
چیونٹا، کیڑا، مچھر، بھنگا　　کچھوا، مینڈک، سیپ اور گھونگا
سارے پنچھی اور پکھیرو　　مور، پپیہا، سارس، پیرو
بھیڑ اور بکری، شیر اور چیتے　　تیرے جلائے سب ہیں جیتے
سب پہ کھلا ہے در رحمت کا　　برس رہا ہے مینہ نعمت کا
خاک سے تو نے بیج اُگائے　　پھر پودے پروان چڑھائے
سیپ کو بخشی تو نے دولت　　اور بخشا مکھی کو امرت

ککڑی میں پھل تو نے لگائے — اور کوڑے پر پھول کھلائے
ہیرا بخشا کان کو تو نے — مشک دیا حیوان کو تو نے
جگنو کو بجلی کی چمک دی — ذرّے کو کندن کی دمک دی
دین سے تیرے اے مرے مولا — سب ہیں نہال ادنیٰ اور اعلیٰ
عام ہے سب پر تیری رحمت — ہیں محروم مگر بد قسمت
پیڑ ہوں چھوٹے یا کہ بڑے یاں — فیض ہوا کا سب پہ ہے یکساں
پھلتے ہیں جو ہیں پھلنے والے — جلتے ہیں جو ہیں جلنے والے
جب اپنی ہی زمیں ہو کلّر — پھر الزام نہیں کچھ مینہ پر
سب کو ترے انعام تھے شامل — میں ہی نہ تھی انعام کے قابل
گر کچھ آتا بانٹ میں میری — سب کچھ تھا سرکار میں تیری
تھی نہ کمی کچھ تیرے گھر میں — نُون کو ترسی میں سانبھر میں
راجا کے گھر پلی ہوں بھوکی — سدا برت سے چلی ہوں بھوکی
پھروں سوچتی ہوں یہ جی میں — آئی تھی کیوں اس نگری میں؟
ہونے سے میرے فائدہ کیا تھا؟ — کس لیے پیدا مجھ کو کیا تھا؟
آن کے آخر میں نے لیا کیا؟ — مجھ کو مری قسمت نے دیا کیا؟
نین دیے اور کچھ نہ دکھایا — دانت دیے اور کچھ نہ چکھایا
جندڑی دی اور خوشی نہ بخشی — دل بخشا، دل لگی نہ بخشی
رہی اکیلی بھری سبھا میں — پیاسی رہی بھری گنگا میں
چین سے جاگی اور نہ سوئی — میں نہ ہنسی جی بھر کے نہ روئی
آ کے خوشی سی چیز نہ پائی — جیسی آئی ویسی نہ آئی
کھایا تو کچھ مزا نہ آیا — سوئی تو کچھ چین نہ پایا
پھول ہمیشہ آنکھ میں کھٹکے — اور پھل سدا گلے میں اٹکے
ہو نہ سکی کچھ دل سے عبادت — اور نہ جمی کاموں پہ طبیعت

کام سنوارا نہ کوئی یاں کا   اور نہ کیا دھندا کوئی واں کا
کام آیا یاں کوئی نہ میرے   اور نہ میں کام آئی کسی کے
قسمت نے جب سے منہ موڑا   آدمیوں کا ہو گیا توڑا
باپ اور بھائی، چچا بھتیجے   سب رکھتے ہوں تیرے کرم سے
پر نہیں پاتی ایک بھی ایسا   جس کو ہو میری جان کی پروا
ناتیوں میں شفقت نہیں پاتی   اپنوں میں اپنایت نہیں پاتی
گھر ہے یہ اک حیرت کا نمونہ   سو گھر والے اور گھر سونا
جس نے خدا کا خوف کیا کچھ   آکے کبھی یاں پوچھ لیا کچھ
سو یہ خوشی کا دل کی ہے سودا   زور کسی پر اب نہیں اپنا
اس میں شکایت کیا ہے پرائی   اپنی ہی قسمت کی ہے برائی
چین گر اپنی بانٹ میں آتا   کیوں تو عورت ذات بناتا
کیوں پڑتے ہم غیر کے پالے   کیوں ہوتے اوروں کے حوالے
اٹھ پھر کیوں دکھ یہ اٹھاتے   جیتے ہی جی کیوں مر جاتے
دکھ میں نہیں یاں کوئی کسی کا   باپ نہ ماں بھائی نہ بھتیجا

سچ یہ کسی سائیں کی صدا تھی
"سکھ سمپت کا ہر کوئی ساتھی"

تیرے سوا اے رحم کے بانی!   کون سنے یہ رام کہانی!
ایک کہانی ہو تو کہوں میں   ایک مصیبت ہو تو سہوں میں
حال نہ ہو دشمن کا ایسا   میرا نازک حال ہے جیسا
کوئی نہیں لاگو اب میرا   باپ نہ بھائی، ساس نہ سسرا
آنکھ میں ایک اک کے ہوں کھٹکتی   پر اپنے بس مر نہیں سکتی
ماں اور باپ عزیز اور پیارے   بیکل ہیں جینے سے ہمارے
رو کے پلک تم کر نہیں سکتی!   ہنس کے غلط غم کر نہیں سکتی

رو دیئے تو سب روتے ہیں گھر کے — رونے نہیں دیتے جی بھر کے
ہنسیئے تو ہنسنا عیب ہے ہم کو — کیونکر الہٰی کاٹے غم کو
گر سسرال میں جاتی ہوں میں — نحس قدم کہلاتی ہوں میں
میکے میں جس وقت ہوں آتی — رو رو کر ہوں سب کو رُلاتی
جب سے یہ دن قسمت نے دکھائے — تکتے ہیں جو ہیں اپنے پرائے
میرا سارا ہنسنا اور رونا — بیٹھنا، اُٹھنا، جاگنا، سونا
سوچ میں میرے سارا گھر ہے — میرے چلن پر سب کی نظر ہے
آپ کو ہوں ہر وقت مٹاتی — پہنتی اچھا ہوں نہ کھاتی
جانتی ہوں نازک ہے زمانا — بات ہے اک یہاں عیب لگانا
موتی کی سی آب ہے عزت — جا کے نہیں آتی پھر حرمت
مہندی میں نے لگانی چھوڑی — پٹی میں نے جمانی چھوڑی
کپڑے مہینوں میں ہوں بدلتی — عطر نہیں میں بھول کے ملتی
سُرمہ نہیں آنکھوں میں لگاتی — بال نہیں برسوں گندھواتی
دو دو چاند نہیں سر دھوتی — اٹھواروں کنگھی نہیں کرتی
کان میں پتے ہاتھ میں کنگن — پہن چکی سب جب تھی سُہاگن
پہنچیوں کا ارماں نہیں اب — چوڑیوں کا کچھ دھیان نہیں کب
اُڑ گئیں دل کی سب وہ ترنگیں — چادر ہے باقی نہ اُمنگیں
آپ کو یاں تک میں نے مٹایا — پر دُنیا کو صبر نہ آیا
وہم نے ہے ایک ایک کو گھیرا — جب دیکھو تب ذکر ہے میرا
کھنچ چکا ہے میرا مقدر — داغ بدی کا میری جبیں پر
مل جاؤں گر خاک میں بھی میں — بچ نہ سکوں طعنوں سے کبھی میں
سچ اگلے لوگوں نے کہا ہے — "بد اچھا بدنام بُرا ہے"
جینے سے گھبرا گئی ہوں میں — اس دم سے تنگ آ گئی ہوں میں

یوں نہ بُری اس جان پہ بنتی ماں مجھ کو اے کاش نہ جنتی
رہتے ہم انجان بلا سے دنیا مجھ سے، مَیں دُنیا سے
اے بے آسروں کے رکھوّیا اے ڈوبے بیڑوں کے کھوّیا
کیجیو میری کشتی بانی! آ پہنچا ہے ڈباؤ پانی!
اب تیرے گی ترائی تیری
ڈوبی ناؤ دُہائی تیری

اے امبر کے چمکتے تارو! اے گھر کے در اور دیوارو!
اے جانی پہچانی راتو! تنہائی کی ڈرانی راتو!
اے نیک اور بد کے دربانو! دیکھتی آنکھو! سُنتے کانو!
ایک دن اس گندی دُنیا سے جانا ہے مالک کے آگے
بوجھ ہیں واں سب تلنے والے پترے سب کے کھُلنے والے
جب واں پُوچھ ہو تیری میری تم سب دیجیو گواہی میری
میں نیکی کا دم نہیں بھرتی! پاکی کا دعویٰ نہیں کرتی!
کیونکر خطا سے بچ سکتا ہے جس نے کچّا دُودھ پیا ہے
خواہ ولی ہو خواہ رشی ہو اِس سے رہائی نہیں کسی کو
گن لیں اگر ہیں اپنی خطائیں ہے یہ یقیں گنتی میں نہ آئیں
پر یہ خدا سے ڈر کے ہوں کہتی منہ پہ یہ آئے بن نہیں رہتی
خواہ بُری تھی خواہ بھلی مَیں بات سے اپنی نہیں ٹلی میں
پڑی تھی جس بے درد کے پالے ہو رہی تھی جس بیری کے حوالے
نام پہ دھونی اس کے رما کر اُن کو رکھا جان گنوا کر
ساتھ نہ قوم اور دیس کا چھوڑا! اور نہ خدا کے عہد کو توڑا
آئے اگر دنیا کو نہ باور اب مجھے کچھ دُنیا کا نہیں ڈر

میرا نگہباں اور رکھوالا

سب سے بڑا ہے جاننے والا

اے ایمان کے رکھنے والے ۔ اے نیت کے پرکھنے والے
میں نہیں رکھتی کام کسی سے ۔ چاہتی ہوں انصاف تجھی سے
حکم پہ چلتی تیرے اگر مَیں ۔ چین سے کرتی عمر بسر میں
مانتی گر مَیں عقل کا کہنا ۔ مجھ کو نہ پڑتا رنج یہ سہنا
کچھ نہ عدالت کا تھا ڈراوا ۔ اور نہ مذہب کا اٹکاوا
ہے دستور یہی دنیا کا ۔ آپ سے اچھا نام خدا کا
لیکن ہٹ پیاروں کی یہی تھی ۔ مرضی غمخواروں کی یہی تھی
اپنے بڑوں کی ریت نہ چھوٹے ۔ قوم کی باندھی رسم نہ ٹوٹے
ہو نہ کسی سے ہم کو ندامت ۔ ناک رہے کنبے کی سلامت
جان کسی کی جاتے تو جائے ۔ آن میں اپنی فرق نہ آئے
دم پہ بنے جو اس کو سہوں میں ۔ لوٹتی انگاروں پہ رہوں میں
درد نہ ہو دل کا کہیں ظاہر ۔ چپکے ہی چپکے کام ہو آخر
مر مٹوں اور کچھ منہ پہ نہ لاؤں ۔ جل بجھوں اور اُف کرنے نہ پاؤں
گُھٹ گُھٹ کر دم اپنا گنوا دوں ۔ جل جل کر آپے کو بجھا دوں
تجھ پہ ہے روشن اے مرے مولا ۔ وقت یہ کیسا مجھ پہ پڑا تھا
بیڑا تھا منجدھار میں میرا ۔ چار طرف چھایا تھا اندھیرا
تھاہ تھی پانی کی نہ کنارا ۔ تیرے سوا تھا کچھ نہ سہارا
شرم ادھر دُنیا کی مجھے تھی! ۔ فکر اُدھر عقبیٰ کی مجھے تھی
روکتے تھے حملے مجھے دل کے ۔ تھا مجھے جینا خاک میں مل کے
نفس سے تھی دن رات لڑائی ۔ دُور تھی نیکی پاس بُرائی
جان تھی میری آن کی دُشمن ۔ آن تھی میری جان کی دشمن

آن سنبھالے جان تھی جاتی   جان بچائے آن تھی جاتی
طے کرتے تھے سات سمندر   حکم یہ تھا ہاں پاؤں نہ ہوں تر
کوئیلا چاروں کھونٹ تھا پھیلا   حکم یہ تھا پلّہ نہ ہو میلا
پیاس تھی لو تھی اور تھی کھرسا   اور دریا سے گزرنا پیاسا
دھوپ کی تھی پلّے پہ چڑھائی   آگ اور گندھک کی تھی لڑائی
درد اپنا کس سے کہوں کیا تھا   آکے پہاڑ اِک مجھ پہ گرا تھا
نفس سے ڈر تھا مجھ کو باقی کا   اس لیے ہر دم تھی یہ تمنا
مر جاؤں یا زندہ رہوں میں   تجھ سے مگر شرمندہ نہ ہوں میں
جان بلا سے جاتے تو جائے   پر کہیں دینی بات نہ آئے
کی نہ کسی نے میری خوشی گر   میں نے کیا ناخوش نہ کسی کو
بات کسی کی میں نے نہ ٹالی   اپنے ہی دم پر سب کی بلا لی
جان نہ سمجھا جان کو اپنی   دیا نہ جانے آن کو اپنی
قول پہ اپنی جمی رہی میں   ہوئی نہ ڈانواں ڈول کبھی میں
دل تھاما آپے کو سنبھالا   سانس تلک منہ سے نہ نکالا
اور نہ اگر کرتی میں ایسا   کیونکر کرتی اور کرتی کیا
بن نہیں آتی دیس سے بھاگے   کچھ نہیں چلتی دیس کے آگے
"لاچاری پر بیت ہے بھاری"   کہہ گئی سچ اک راج کماری

اے اچھے اور برے کے بھیدی
کھوٹے اور کھرے کے بھیدی

چھپی، ڈھکی کے کھولنے والے   بُری بھلی کے تولنے والے
بھید دلوں کے جاننے والے   پاپ اور پُن کے چھاننے والے
عیب اور گُن سب تجھ پہ ہیں روشن   پاپ اور پُن سب تجھ پہ ہیں روشن

عیب نہ اپنا تجھ کو جتانا! ہے دائی سے پیٹ چھپانا
میں نہیں آخر پاک بدی سے بنی ہوں پانی اور مٹی سے
تو نے بنایا تھا مجھے جیسا چاہیئے تھا ہونا مجھے ویسا
بس ہمیں جتنا تو نے دیا ہے اُس سے سوا قدرت ہمیں کیا ہے
کان اور آنکھیں ہاتھ اور بازو جن جن پر تھا یاں مجھے قابو
سب کو بدی سے میں نے بچایا سب کو خودی سے میں نے ہٹایا
اُٹھتے بیٹھتے روکا سب کو سوتے جاگتے ٹوکا سب کو
ہاتھ کو ہلنے دیا نہ بے جا! پاؤں کو چلنے دیا نہ ٹیڑھا
آنکھ کو اُٹھنے دیا نہ اتنا جس سے کہ پیدا ہو کوئی فتنا
کان کو رکھا دُور بُلا سے اوپری آوازوں کی ہوا سے
روک کے یُوں اور تھام کے آپا مَیں نے یہ کاٹا اپنا رنڈاپا
ایک نہ سنبھلا میرا سنبھالا تھا بے تاب جو اندر والا!
حال کروں میں دل کا بیاں کیا حال ہے دل کا تجھ سے نہاں کیا
دھوپ تھی تیز اور ریت تھی تپتی مچھلی تھی اِک اس میں تڑپتی!
جان نہ مچھلی کی تھی نکلتی! اور نہ سر سے دھوپ تھی ٹلتی
گو دم بھر اس دل کی لگی نے ٹھنڈا پانی دیا نہ پینے
تُو ہے مگر اس بات کا دانا میں نے کہا دل کا نہیں مانا
زور تھا میرا دل پہ جہاں تک میں نے سنبھالا دل کو وہاں تک
تھامنا دل کا کام تھا میرا اور تھمانا کام تھا تیرا
پکڑے اگر تو دل کی خطا پر میں راضی ہوں تیری رضا پر
رکھ تکلیف میں یا راحت میں ڈال جہنّم یا جنّت میں
اب نہ مجھے جنّت کی تمنّا اور نہ خطرہ کچھ دوزخ کا
آئے گی جنّت راس کب اسکو جلنے میں جس کی عمر کٹی ہو

ڈر دوزخ کا پھر اُسے کیا ہو — جس نے رنڈاپا جھیل لیا ہو[1]
پر تجھ سے اِک عرض ہے میری — رَد نہ ہو کہ درگاہ میں تیری
جو قسمت نے مجھ کو دکھایا — خوش نا خوش سب میں نے اُٹھایا
مجھ ناچیز کی ہے کیا طاقت — جو منہ پر کچھ لاؤں شکایت
عُمر بہت سی کاٹ چکی ہُوں — یہ دن بھی کٹ جائینگے جُوں تُوں
اپنے سے کچھ کہہ نہیں سکتی — پر یہ کہے بِن رہ نہیں سکتی
مَیں ہی اکیلی نہیں ہوں دُکھیا — پڑی ہے لاکھوں پر یہی بپتا
بس نے بہت یاں اُجڑ گئے گھر — بن کے ہزاروں بگڑ گئے گھر
جلیں کروڑوں اسی لپٹ میں — پدموں پُھنکیں اسی مرگھٹ میں
بالیاں ایک اک ذات کی لاکھوں — بیاہیاں ایک اک رات کی لاکھوں
ہو گئیں آخر اسی الم میں — کاٹ گئیں عُمریں سب اسی غم میں
سیکڑوں بیچاری مظلومیں — بھولی نادانیں معصومیں[2]
بیاہ سے انجان اور منگنی سے — بنے[3] سے واقف اور نہ بنی سے
ماؤں سے جو منہ دھلواتی تھیں — رو رو مانگ کے جو کھاتی تھیں
تھپک تھپک تھے جنکو سُلاتے — گھڑک گھڑک[4] تھے جنکو کھلاتے
جن کو نہ شادی کی تھی تمنا — اور نہ منگنی کا تھا تقاضا
جن کو نہ آپے کی تھی خبر کچھ — اور نہ رنڈاپے کی تھی خبر کچھ
بھلی سے واقف تھیں نہ بری سے — بد سے مطلب تھا نہ بُری سے
رخصت چلے اور چوتھی کو — کھیل تماشا جانتی تھیں جو
ہوش جنھیں تھا رات نہ دن کا — گڑیوں کا سا بیاہ تھا جن کا

---

[1] طبع لاہور : "اسے کیا ہے" ۔ "جھیل کیا ہے"۔ [2] طبع لاہور : "بھولیں نادانیں معصومیں"

[3] بنا : دولھا ۔ بنی : دُلھن ۔ فاضل

[4] گھڑکنا : بچوں کو ڈانٹنا ۔

دو دو دن رہ رہ کے سُہاگن — جنم جنم کو ہوئیں بِرَہن
دُولہا نے جانا، نہ دُلہن کو — دُلہن نے پہچانا نہ سجن کو
دل نہ طبیعت شوق نہ چاہت — مفت لگا لی بیاہ کی تہمت
شرط سے پہلے بازی ہاری — بیاہ ہوا اور رہیں کنواری
سیلانی جب باغ میں آئے — پھول ابھی تھے کھلنے نہ پائے
پھول کھلے جس وقت چمن میں — جا سوئے سیلانی بَن میں
پیت نہ تھی جب پایا پیتم — جب ہوئی پیت[1] گنوایا پیتم
ہوش سے پہلے ہوئی ہیں بیوہ — کب پہنچے گا پار یہ کھیوا
خیر سے بچپن کا ہے رنڈاپا — دُور پڑا ہے ابھی بڑھاپا
عمر ہے منزل تک پہنچانی — کاٹنی ہے بھرپور جوانی
شام کے مرنے کا ہے یہ رونا — ساری رات نہیں اب سونا
آئی نہیں دُنیا میں الٰہی — ایسی کسی بیڑے پہ تباہی
آئیں بلکتی گئیں سسکتی — رہیں ترستی اور پھڑکتی
کوئی نہیں جو غور کرے اب — نبض پہ ان کے ہاتھ دھرے اب
دُکھ اُن کا آئے اور پُوچھے — روگ اُن کا سمجھے اور بُوجھے
چوٹ نہ جن کے دل پہ لگی ہو — وہ کیا جانیں دل کی لگی کو
بے دردوں سے پڑا ہے پالا — تو ہی اب ان کا ہے رکھوالا

اپنی بیتی ہے یہ کہانی
اب یہ دھان رہے بن پانی

اے غمخوار ہر اک بے کس کے — حامی ہر عاجز بے بس کے
ہے اپنے عاجز بندوں پر — پیار ترا ماں باپ سے بڑھ کر
جس نے لگی میں تجھ کو پکارا — سامنے تیرے ہاتھ پسارا

---

[1] پیت: محبت، پیتم: عاشق۔

پھرا نہ خالی اس چوکھٹ سے / گیا نہ پیاسا اس پنگھٹ سے
کس کو زمانہ نے ہے ستایا / تو نہیں جس کے آڑے آیا
اُجڑے کھیڑے تو نے بسائے / ڈوبے بیڑے تُو نے ترائے
مظلوموں کی داد کو پہنچا / قیدیوں کی فریاد کو پہنچا
بخت سر ملک آباد کرائے / اور بَردے آزاد کرائے
عام تیری رحمت جب ٹھہری / دور ہے پھر رحمت سے تیری
داد ہر اک مظلوم کی دے تو / اور رانڈوں کی خبر نہ لے تو؟
عورت ذات کا تنہا جینا / ہر دم خونِ جگر کا پینا
گھر بستے کی آس نہ رہنی / ساری عمر جدائی سہنی
ہے وہ بلا جو سہی نہ جائے / بپتا ہے جو کہی نہ جائے

قدر اس کی یا تو پہچانے
یا جس پہ گذری ہو وہ جانے

اے خاوند، خداوندوں کے / مالک خاوند اور بندوں کے
واسطہ اپنی خداوندی کا / صدقہ اپنی خداوندی کا
تو یہ کسی کو داغ نہ دیجو / کسی کو بے وارث مت کیجو
کیجو جو کچھ تیری خوشی ہو / رانڈ مگر کیجو نہ کسی کو
مسند تکیہ، عزت حرمت / نوکر چاکر دولت حشمت!
چاندی سونا نقدی غلّہ / گہنا پاتا تُوم[1] اور چھلّا
سائیں بن جو چیز ہے گھر میں / خاک ہے سب عورت کی نظر میں
دل کی خوشی اک آس پہ تھی سب / سو وہ ہزاروں کوس گئی اب
پھول کچھ اب کانٹوں سے نہیں کم / جنّت بھی ہو تو ہے جہنم
باغ نظر میں اس کی خزاں ہے / آنکھ میں تاریک اس کی جہاں ہے

---
[1] تُوم: زیور۔ گہنا پاتا۔ فاضل

عیش ہے اس کے واسطے ماتم عید ہے اس کے حق میں محرم
جس دُکھیا پر پڑے یہ بپتا کر اُسے تو پیوند زمیں کا
یا عورت کو پہلے بُلا لے یا دونوں کو ساتھ بُلا لے
یا یہ مٹا دے رِیت جہاں کی جس سے گئی پریت یہاں کی
جس سے ہوئے دل سیکڑوں بسمل جس نے ہزاروں کر دیئے گھائل
جس نے کلیجے آگ میں بھونے جس نے بھرے گھر کر دیئے سُونے
خوف دلوں سے کھو دیا جس نے شرم سے دیدے دھو دیئے جس نے
قوم کی جس بِن آن ہے جاتی دیس کی جس پر جان ہے جاتی
جس نے کئے دل رحم سے خالی رِیت ہے جو دُنیا سے نرالی
قوم سے تو یہ رِیت چھڑا دے بندیوں کی بیڑی یہ تڑا دے
سہل اور مشکل تجھ کو ہے یکساں ہم کو ہے مشکل تجھ کو ہے آساں
رنج اور دُکھ قبضے میں ہے تیرے چین اور سُکھ قبضے میں ہے تیرے
ملتے ہیں پتّے تیرے ہلائے کھلتے ہیں غنچے تیرے کھلائے
مٹھی میں ہیں تیری ہوائیں قابو میں ہیں تیری گھٹائیں
تجھ سے ہے دریاؤں کی روانی تیرے بہائے بہتے ہیں پانی!
جھیل، سمندر، پربت، رائی کہنے میں ہے سب تیری خدائی
ناتا، رشتہ، نسبت، شادی سوگ، رنڈاپا، قید، آزادی
قوم کی ریتیں، دیس کی رسمیں کیا ہے وہ جو تیرے نہیں بس میں
کام کوئی مشکل نہیں تجھ کو ایک یہ کیا، گر تیری خوشی ہو

سوت لگے پتھر سے نکلنے
ناؤ لگے ریتی میں چلنے

اے عزّت اور عظمت والے رحمت اور عدالت والے
دُکھڑا تجھ سے کہنا دِل کا اِک بشریّت کا ہے تقاضا

دل پہ ہے جب برچھی کوئی چلتی — آہ کلیجے سے ہے نکلتی
جب کوئی دُکھ یاد آ جاتا ہے — جی بے ساختہ بھر آتا ہے
ورنہ اس دُنیا میں دھرا کیا[۱] — خواب سا اِک ہے گا یہ تماشا
دُکھ سے یہاں کے ہے گھبرانا کیا — سکھ پہ ہے یاں کے اترانا کیا
عیش کی یاں مہلت ہے نہ غم کی — سب یہ نمائش ہے کوئی دم کی
آنی جانی چیزیں ہیں خوشیاں — چلتی پھرتی چھانو ہے ارماں
منگنی، بیاہ، برات اور رخصت — میل ملاپ، سُہاگ اور سنگت
ہیں دو دن کے سب بہلاوے — آگے چل کر ہیں پچھتاوے
ریت کی سی دیوار ہے دُنیا — اوچھے کا سا پیار ہے دُنیا
بجلی جیسی چمک ہے اس کی — پل دو پل کی جھلک ہے اس کی
پانی کا سا ہے یہ بچارا — جگنو کا سا ہے چمکارا
آج یہاں جنگل میں منگل — کل سُنسان پڑا ہے جنگل
آج ہے میلا ہر دم دونا — اور کل گاؤں پڑا ہے سُونا
آج ہے رہنے کی تیاری — اور کل ہے چلنے کی باری
آج ہے پانا، کل ہے کھونا — آج ہے ہنسنا کل ہے رونا
کبھی ہے بادھا کبھی ہے گھاٹا — کبھی جوار اور کبھی ہے بھاٹا
ہار کبھی اور جیت کبھی ہے — اِس نگری کی ریت یہی ہے
ساتھ سُہاگ اور سوگ ہے یاں کا — ناؤ کا سا سنجوگ ہے یاں کا
خوشی میں غم یاں ملا ہوا ہے — اُمرت میں بِس گھلا ہوا ہے
سیر کو جو اس باغ میں آئیں — دیکھ کے پھل کو ہاتھ لگائیں
یاں ہر پھل اندرائن کا ہے — دیکھنے سے چکھنے میں بُرا ہے
عیش جنہوں نے سدا اڑائے — وہ بھی ہیں آخر کو پچھتائے

---

[۱] طبع لاہور میں "ورنہ اس دنیا میں بھرا کیا" — فاضل

رہے ہیں گر کر جو چڑھے ہیں جو یاں   گھٹے ہیں آخر بڑھے ہیں جو یاں
جو بیاہے وہ ہیں پچھتاتے   بن بیاہے ہیں بیاہ مناتے
اِس پھل کا ہے یہی پریکھا   جو نہیں چکھا وُہی ہے میٹھا
خوش نہ ہوں خوشیوں کے متوالے   ہیں یہ نشے سب اُترنے والے
غم کی گھٹا آتی ہے گرجتی   گھڑی ہیں یاں گھڑیال کی بجتی
رہگیروں کا بندھا ہے تانتا   ایک آتا ہے ایک ہے جاتا
جو آئے ہیں اُن کو ہے جانا   جو گئے اُن کو پھر نہیں آنا
خواہ ہوں رانڈ اور خواہ سُہاگن   موت ہے سب کی جان کی دُشمن
ایک ہے گو آج ایک سے بہتر   مر گئیں جب دونوں ہیں برابر
اور کوئی گر انصاف سے دیکھے   مر کے اُسے نسبت نہیں اس سے
عیش گئی وُہ چھوڑ کے یاں سے   قید گئی یہ کاٹ کے یاں سے
اس کو پڑی کل اس کی گئی کل   یہ گئی ہلکی وُہ گئی بوجھل
اس کا دل اس دنیا سے اُٹھاتا   ہے ناخن سے گوشت چھٹاتا
جان یہ آسان دیتی ہے ایسی   بُو ہے نکلتی پھُول سے جیسی
غم ہو غرض یا عیش ہو کچھ ہو   ہے ہمیں جانا چھوڑ کے سب کو
تیرے سوا یہاں اے مرے مولا!   کوئی رہا ہے اور نہ رہے گا
پڑی تھی سونی جب یہ نگریا   تیری ہی تھی یاں کھڑی اٹریا
پھر یہ نگریا اُجڑ کے ساری   تیری ہی رہ جائے گی اٹاری
تھا نہ کچھ آگے تیرے سوا یاں   اور رہے گا کچھ نہ سدا یاں
یاں کوئی دن دُکھ پایا تو کیا   اور کوئی دم سُکھ پایا تو کیا
اب نہ مجھے کچھ رنج کی پروا   اور نہ آسائش کی تمنّا
چاہتی ہوں اِک تیری محبت   اور نہیں رکھتی کوئی حاجت
گھونٹ اک ایسا مجھ کو پلا دے   تیرے سوا جو سب کو بھُلا دے

آئے کسی کا دھیان نہ جی میں — کوئی رہے ارمان نہ جی میں
فکر ہو اچھی کی نہ بُری کی — تیرے سوا دُھن ہو نہ کسی کی
کوئی جگہ اس دل میں نہ پائے — یاد کوئی بھُولے سے نہ آئے
سینہ یہ تجھ سے بھرا ہو سارا — میت سمائے اس میں نہ پیارا
دل نے بہت یاں مجھ کو ستایا — میت کا برسوں مزا چکھایا
خواب میں دیکھا اک سوانگ نرالا — آگ میں جیتے جی مجھے ڈالا
میرا اور اپنا چین گنوایا — آپ جلا اور مجھ کو جلایا
اُٹھ نہیں سکتے مجھ سے اب الم — یہ دنیا کے ناشادنی غم
دل میں لگن بس اپنی لگا دے — سارے غم اپنے غم میں کھپا دے
غیر کے رشتے توڑ دے سارے — دل کے بکھیڑے چھڑا دے سارے
جب مجھے تنہا کیا ہے پیدا — تو مجھے بندہ کر نہ کسی کا
وہاں سے اکیلی آئی ہوں جیسی — ویسی ہی یاں سے جاؤں اکیلی
ساتھ کوئی غم لے کے نہ جاؤں — تیرے سوا کھو دوں جسے پاؤں
دل نہ پھرے دُنیا میں بھٹکتا — کوئی رہے کانٹا نہ کھٹکتا
جی سے نشاں پیاروں کا مٹا دوں — پیار کے منہ کو آگ لگا دوں
تو ہی ہو دل میں تو ہی زباں پر — مار کے جاؤں لات جہاں پر

پاؤں تجھے اک اک کو گنوا کر
خاک میں جاؤں سب کو ملا کر

(۹)

پھوٹ اور ایکے کا مُناظرہ

۱۸۸۲ء

پھوٹ سے ایکے نے کی یہ گفتگو
میں ہوں جہاں کا چمن آرا کہ تو؟
میرا ہے یا تیرا مُبارک قدم
مجھ سے ہے یا تجھ سے اقبالِ اُمم؟
اپنی ستائش نہیں زیبا مگر
حق نہ جتاؤں تو ہے خوفِ ضرر
منزلِ ہستی کا ہوں میں رہنموں
کچھ نہ ہو اے پھوٹ اگر میں نہ ہوں
مجھ سے ہی اجسام کو ہے التیام[1]
مجھ سے ہی اجرام میں ہے انتظام
میری بدولت ہے کھچا اور تنا
جال یہ سب ثابت و سیار کا
میرا اگر ہو نہ قدم درمیاں
زیر و زبر ہو ابھی نظمِ جہاں
دانوں کو دیتا ہوں میں خرمن بنا
قطروں سے دیتا ہوں میں دریا بہا
ڈھیلوں سے چنتا ہوں حصارِ حصیں
رشتوں کو کر دیتا ہوں حبل المتیں
میں ہوں اگر موروں کے درمیاں
ان کا سلیماں کو کردوں میہماں
مجھ سے ہے ہر قوم اعانت طلب
کرتے ہیں طاقت مری تسلیم سب
قوموں کے اقبال کی میں ہوں دلیل
میں نہیں جس قوم میں وہ ہے ذلیل
مجھ سے گھرانوں کی ہے چھاتی پہاڑ
میں نہیں جس گھر میں وہ گھر ہے اُجاڑ
ملک ہیں آباد مری ذات سے
یُمن[2] ہے اِک میری کرامات سے

---

[1] پیوستگی۔ زندگی قرارِ اجزا - فاضل

[2] یُمن : برکت -

میں نے ہے جس قوم کو بخشا وقار
قوم وہی قوم ہے، باقی کُمھار
بختِ عدو مال[۱] ہے اس قوم کا
بندہ خود اقبال ہے اس قوم کا
نرغہ میں گھِر جائے گر اک ان کا فرد
لاکھ پہ بھاری ہے بوقتِ نبرد
ڈال نہیں سکتا کوئی اس پہ ہاتھ
جوجھتی ہے قوم تمام اس کے ساتھ
میرا ہے جس ملک میں جاری عمل
واں کبھی آنے نہیں پاتا خلل
میرے تصرف میں ہے جو سرزمیں
واں کوئی بے کس کوئی تنہا نہیں
ایک ہے زخمی تو ہیں سب دلفگار
ایک ہے مظلوم تو حامی ہزار
ایک کو گر دیکھتے ہیں مضطرب
پیٹ کو پکڑے ہوئے کڑھتے ہیں سب
آگ اگر گھر میں لگی ایک کے
قوم میں گھر گھر دھوئیں اٹھنے لگے
کل کی مصیبت میں ہیں کل مبتلا
ایک پہ آتی نہیں کوئی بلا
ضعف دباتا نہیں ان کو کبھی
رکھتے ہیں کمزور بھی واں دل قوی
غم نہیں افلاس کا مفلس کو واں
ایک کا افلاس ہے سب پر گراں
ایک کی خواری سے ہیں نادم ہزار
ایک ہے رسوا تو ہیں سب شرمسار

ایک کی عزت ہو تو نازاں ہیں سب
ایک ہو گر شاہ تو سلطاں ہیں سب

سنتی ہے اے خانہ برانداز پھوٹ
سچ ہے یہ سب میرا بیاں یا کہ جھوٹ
مجھ میں نہیں عیب کچھ اس کے سوا
ساتھ میرا تیرا ہے کھٹکا لگا
ذات ہے میری ہمہ کامل مگر
دیتی ہے گہنا مجھے تو آن کر
ہوتی اگر تیری نہ یاں بست و بود
میرا مبارک تھا جہاں میں وجود
چشمۂ رحمت ہے جماعت و لے
کرتی ہے تو آ کے مکدر اسے
چار جو مل بیٹھتے ہیں یاں کبھی
سب نظرِ بد سے ہیں لرزاں تری
صلح کا رہتی ہے بُرا تکتی تو
دو کو بہم دیکھ نہیں سکتی تو

---

[۱] دشمن کو تباہ کرنے والا — فاضل

قطع و برش تیری جبلّی ہے خُو | گوشت جُدا کرتی ہے ناخن سے تُو
بھائیوں کو کرتی ہے اغیار تُو | یاروں کو کر دیتی ہے بے یار تُو
ڈالتی ہے ان میں نزاع اور خلاف | دو کے نہیں چھوڑتی دل ان میں صاف
قوم میں جو دیکھئے چھوٹا بڑا | چُنتا ہے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد جُدا
مضحکہ خود اپنا بناتے ہیں وہ | اپنے پہ عالم کو ہنساتے ہیں وہ
سُوجھتی ملّت کی نہیں کوئی بات | یہ جو کہے دن تو وہ کہتا ہے رات
رہتا ہے ایک ایک کے درپے نہاں | جس سے جسے دیکھیئے ہے بدگماں
زید کا ہے عمرو سے ظاہر ملاپ | دل میں بھرا دونوں کے کین ہے پاپ
ایک یہ کہتا ہے کہ میری چلے | دوسرا خواہاں کہ زک اُس کو ملے
دیکھیے جس کو وہ ہے اس تاک میں | یاروں کے منصوبے ملیں خاک میں
قوم کی قوم آتی ہے بے کس نظر | جاتی ہیں جھاڑو کی سی سینکیں بکھر
عیب ہیں جو تجھ میں وہ مجھ میں نہیں | خوُبیاں جو مجھ میں ہیں تجھ میں نہیں

پھُوٹ نے ایکے سے سُنا جب یہ لاف | بولی کی تقصیر ہو میری مُعاف
نام ہے بدنام مقدر مرا | ذکر بُرائی سے ہے گھر گھر مرا
پر کوئی انصاف سے دیکھے اگر | میں ہوں وہی جو کہ ہے تو سربسر
عیب ہیں کچھ مُجھ میں تو تجھ میں بھی ہیں | خوبیاں تجھ میں بھی ہیں مجھ میں بھی ہیں
خلق کے ہم دونوں مددگار ہیں | دوست کا تو یار ہے دشمن کی میں
اپنوں سے تُو غیر کو کرتا ہے زیر | میں ہوں کہ دل غیروں کے رکھتی ہوں شیر
میں کروں تائید نہ تیری اگر | ہو کوئی خوُبی نہ تیری جلوہ گر
کام رہیں سارے ادھورے ترے | ہوں کبھی منصوبے نہ پورے ترے
میرے ہی بل چلتی ہے گاڑی تری | مجھ سے ہی سرسبز ہے باڑی[1] تری

---

[1] کھیتی، کیاری — فاتسل

ہیں جو نہ ایران کو دلاتی شکست
رومیوں کے حوصلے ہو جاتے پست

ڈالتی بغداد میں گر میں نہ جال
کرتی نہ عبّاسیوں کو پائمال

کام نہ آتا کوئی تیرا ہُنر
فتح نہ پاتی کبھی فوجِ تتر

ہوتی بخارا میں نہ گر میں مُخل
کرتی نہ ساسانیوں کو مضمحل

غزنوی اس طرح نہ پاتے فروغ
ٹھہرتے دعوے ترے سارے دروغ

ہند میں میں گل[۱] نہ کھلاتی اگر
رنگ نہ یاں اپنا جماتی اگر

غوریوں کو فتح دلاتا نہ تو
خلجیوں کے کام کچھ آتا نہ تو

لودھیوں کے بڑھتے نہ آگے قدم
مغلوں کا یاں آکے نہ گڑتا علم

ہند میں کرتی نہ اگر میں وطن
پھیلتے مغرب کے نہ یاں علم و فن

یہ تو لیا تو نے سُن اے اتفاق
اب کہوں کچھ اور جو گزرے نہ شاق

تجھ سے سوا مجھ میں ہے سچ اس کو جان
جلوہ گر انصاف الٰہی کی شان

تو جو کسی قوم کا بنتا ہے یار
چاہتا ہے بگڑے نہ وہ زینہار

اس کو نہ پیش آئے کبھی روزِ بد
بات رہے اس کی بنی تا ابد

حصّہ میں اُس کے رہے عزّ و شرف
رشک سے قومیں تکیں اس کی طرف

آئے نہ اقبال کو اس کے زوال
دوست رہیں شاد عدو پائمال

تیرا تو یہ خاصہ ٹھہرا مگر
عادتِ حق کی نہیں تجھ کو خبر

آج کسی کو جو چڑھاتا ہے وُہ
دوسرے دن اس کو گراتا ہے وُہ

جزر ہے دریا میں پس از مد ضرور
عزّت و دولت کی ہے اک حد ضرور

ختم جب اقبال کا ہوتا ہے دور
سارے بگڑ جاتے ہیں قوموں کے طور

خصلتیں اُن کی نہیں رہتیں درست
فرض ادا کرنے میں رہتے ہیں سُست

بھول کے بھی وہ نہیں لاتے بجا
بندوں کے حق اور حقوقِ خدا

۱؎ گل کھلانا: شوخی یا شرارت کرنا۔ فاضل

ملتی ہے ہر چند کہ مہلت انہیں — پر کبھی ہوتی نہیں جرأت انہیں
جب نہیں غفلت کا اترتا خمار — ہوش میں آتے نہیں وہ زینہار
کرتے سزا سے نہیں پھر درگزر — کارگزارانِ قضا و قدر
لیتے ہیں چھین ان سے حکومت کبھی — کرتے ہیں مسلوب ان کی لیاقت کبھی
علم کبھی دیتے ہیں ان کا مٹا — دیتے ہیں دولت کبھی ان کی مٹا
اس پہ بھی ہوتے نہیں جب ہوشیار — بھیجتے ہیں قحط و وبا بار بار
کوڑے یہ کھا کھا کے گئے گر سنبھل — سر سے بلا قوم کے جاتی ہے ٹل
ورنہ مجھے کرتے ہیں مامور واں — تاکہ کروں قدرتِ باری عیاں
الحذر اس وقت سے اے اتفاق — ان کے جب کہتی ہوں میں الفراق
آ گئے اس قوم کے بس دن برے — حق نے کیا جس پہ مسلط مجھے
کوہ کو کرتی ہوں پرِ کاہ میں — شیروں کو کر دیتی ہوں روباہ میں
قدر و بہا[1] قوم کی لیتی ہوں چھین — کوڑی کے کر دیتی ہوں ہیں تین تین
کرتے نہیں غیر انہیں آ کے پست — پاتے ہیں وہ اپنے ہی ہاتھوں شکست
دیتے ہیں دھیان انکا بداندیش چھیڑ — آپ ہی مر جاتے ہیں سر پھوڑ پھوڑ
آگ پہ گویا کہ ہوں بارود میں — قوموں کو کر دیتی ہوں نابود میں
ہو گیا جس ملک میں یہاں میرا راج — قحط و وبا کی نہیں واں احتیاج
قحط و وبا کرتے ہیں جانیں تلف — کھوتی ہوں میں قوم کا عز و شرف
دیتے ہیں وہ قوم کی گنتی گھٹا — کرتی ہوں میں قوم کو بالکل فنا
حکم یہی ہے مجھے اے اتفاق — ڈالتی ہوں اس لیے ان میں نفاق
ہے مری تقصیر خلافِ ادب — میں ہوں فرستادۂ درگاہِ رب

سلسلہ تقریر کا جب بڑھ گیا — پھوٹ کو یہ غیب سے آئی صدا

---

[1] بہا: قیمت۔

ڈال دیے تو نے دلوں میں شگاف　　کب تلک اے جھوٹ یہ لاف و گزاف
حد سے سوا بڑھ گئی تو، شرم شرم !　　جھوٹ میں اور اتنا غلو، شرم شرم
چیز حقیقت میں کوئی تو نہیں　　تجھ میں حقیقت کی کہیں بو نہیں
چیز وہی چیز حقیقت میں ہے　　تعبیہ جو خلق کی فطرت میں ہے
فطرتِ انسان کے ہے جو کچھ خلاف　　ہیچ ہے وہ اس میں نہیں اختلاف
طبعِ بشر میں ہے ودیعت نفاق　　واں نہیں مطبوع بجز اتفاق
روم ہوں یا ترک، عجم یا عرب　　مہر و محبت پہ ہیں مجبول[1] سب
ایک کو ہے ایک کی جانب جھکاؤ　　ایک سے ہے ایک کے دل کو لگاؤ
ہوتی کچھ اے جھوٹ اگر تیری اصل　　مختلف انسان کی ہوتی نہ نسل
تو وہ سرچشمہ نہیں جس میں ہو آب　　تیری نمائش ہے برنگِ سراب
ایسے بہت کرتی ہیں جلوے عیاں　　آدمِ خاکی کی غلط فہمیاں
جیسے کہ بے اصل خبر گاہ گاہ　　ملک کرا دیتی ہے دم میں تباہ
تجھ سے بھی پڑ جاتے ہیں اکثر بگاڑ　　رائی کے ہو جاتے ہیں بن کر پہاڑ
ہے یہ نمائش تری اے خود نما　　شعبدہ اک وہمِ غلط کار کا
سیکڑوں گھر جہل نے گھالے[2] ہیں یاں　　پردے بہت عقلوں پہ ڈالے ہیں یاں
جہل کا چھایا ہے اندھیرا جہاں　　ملک کو ظلمت نے ہے گھیرا جہاں
ٹھیک نہیں سوجھتی واں کوئی چیز　　نفع و ضرر میں نہیں ہوتی تمیز
قوم کی تعریف نہیں جانتے　　اپنی حقیقت نہیں پہچانتے
کر نہیں سکتے وہ حقائق میں غور　　کہتے ہیں جڑ اور ہے ٹہنی ہے اور
جانتے دریا کو ہیں اک شے جدا　　قطروں سے کہتے ہیں کہ وہ ہے جدا
پر یہ عزیزوں کو نہیں سوجھتا　　ہے انہیں قطروں سے وہ دریا بنا

---

[1] مجبول : مخلوق مفطور پیدا شدہ ۔
[2] گھر گھالنا : خاندان تباہ کرنا ۔

بس یہی انسان کی غلط کاریاں — دیتی ہیں پہنچا اسے اکثر زیاں
ہوتا ہے بیٹھا ہوا جس شاخ پر — تولنے لگتا ہے اُسی پر تبر
چلنے کو جس راہ میں ہوتا ہے وہ — کانٹے اُسی راہ میں بوتا ہے وہ
پینے کا جو اس کے ہے جاں بخش جام — زہر ملاتا ہے اُسی میں وہ خام
حق کبھی ہونے نہیں دیتیں عیاں — جہل کی چھائی ہوئی تاریکیاں
ہوتی ہے پر ختم شبِ تار جب — پھیلتے ہیں علم کے انوار جب
شے نہیں رہتی کوئی پیشِ نظر — نورِ حقائق کے سوا جلوہ گر
پھر نظر آتا ہے سچ اور جھوٹ جھوٹ — تفرقہ رہتا ہے نہ رہتی ہے پھوٹ
وہمِ دوئی دل میں سماتا نہیں — اپنے سوا کچھ نظر آتا نہیں
بھائیوں پر پہلے کیے تھے جو وار — اپنا بدن پاتے ہیں اس سے فگار
ان پہ چلائے تھے جو تیر و سناں — اپنے بدن پر ہیں اب اُن کے نشاں
اُن کے سمجھ کر جو بگاڑے تھے کام — کام نکلتے ہیں وہ اپنے تمام

علم ہو جس قوم کا یاں راہبر — برکتیں اللہ کی اُس قوم پہ
جانتے ہیں وہ برکاتِ وفاق — اُن پہ ہیں روشن خطراتِ نفاق
فرق نہیں اُن کے زن و مرد میں — قوم کی طاقت ہے ہر اک فرد میں
رتبہ یہ ایکے نے ہے ان کو دیا — لاکھوں کروڑوں پہ ہیں فرمانروا
زور سے ہیں ان کے زبردست زیر — لومڑیاں سامنے اُن کے ہیں شیر
اے کہ تری ذات ہے عالم پناہ — اسود و احمر کا ہے تو بادشاہ
جوڑنا ٹوٹوں کا تیرے ہاتھ ہے — تیری صفت جامعِ اشتات[۱] ہے
مُنتجِ ادبار[۲] ہے جب تک نفاق — مثمرِ اقبال[۳] ہے جب تک وفاق

---

۱ اشتات: متفرقات، جامعِ اشتات: بکھری چیزوں کو یک جا کرنے والا۔
۲ تباہی کا نتیجہ دینے والا۔ ۳ اقبال کا ثمر دینے والا۔

تلخ ہے جب تک ثمرِ اختلاف
ہے تر و تازہ شجرِ ائتلاف[1]

بھیجیو نکبت نہ کسی قوم پر
رکھیو ہر ایک قوم کو شیر و شکر

لوٹے نہ آفاق میں سنگت کوئی
ہو نہ پراگندہ جماعت کوئی

بندے سے ہو بندہ نہ کوئی جدا
بکھرے نہ شیرازہ کسی قوم کا

پھوٹ کسی قوم میں پڑ جائے جب
ایک سے ایک ان میں بچھڑ جائے تب

ورنہ اگر ہو نہ ملاپ ان کو راس
اور نہ ہو سر جوڑنے کی ان کے آس

وہ جئیں تو کیا جیسے سب بے آبرو
جلد اٹھا لے انہیں دنیا سے تو

پھوٹ ہو جس قوم میں وہ قوم کیا
حق میں ہے اس قوم کے بہتر فنا

---

[1] ائتلاف : الفت و یگانگت دینے والا۔

(۱۰)

دولت اور وقت کا مناظرہ

۱۸۸۷ء

ایک دن وقت نے دولت سے کہا: — سچ بتا تجھ میں ہے فوقیت کیا؟
تو ہے سرمایۂ عزت، یا میں؟ — تو ہے انسان کی دولت، یا میں؟
ہے زمانہ میں بڑی بات تری — دیکھیں ہم بھی تو کرامات تری
وقت سے ہنس کے یہ دولت نے کہا: — تجھ کو اے وقت نہیں عقل ذرا
ہے عجب جس کو خدائی مانے — اس کی تو خوبیوں میں شک جانے
سبز ہے گلشنِ دُنیا مجھ سے — لیتے ہیں توشۂ عقبیٰ مجھ سے
نام اقبال ہے آنے کا مرے — لقب ادبار ہے جانے کا مرے
مجھ سے پاتے ہیں ہنر نشو و نما — علم بھی ایک طفیلی ہے مرا
لاکھ رکھتا ہو کوئی فضل و کمال — لاکھ رکھتا ہو کوئی حسن و جمال
خوبیاں لاکھ کسی میں ہوں مگر — میں نہ ہوں تو نہیں کچھ قدرِ بشر
چند روز آ گئی میں جس کے کام — زندہ تا حشر رہا اُس کا نام
جس سے مجھ کو نہ سروکار رہا — وہ سدا خوار و نگوں سار رہا
منہ ذرا جس کو لگا لیتی ہوں — اُس کی میں شان بڑھا دیتی ہوں
چلتے ہیں مجھ سے سب خورد و کلاں — پھرتے ہیں دُھن میں مری پیر و جواں
گر نہ لوں میں تو کوئی کام نہ ہو! — کسی آغاز کا انجام نہ ہو
کوئی حاجت نہ ہو دُنیا کی روا — درمیاں گر نہ قدم ہو میرا

ہیں رُکھائی سے مری سب لرزاں
میرے اغماض سے ڈرتا ہے جہاں

جس سے دُنیا میں نہ مَیں راہ کروں
ہو اگر شیر تو روباہ کروں

الغرض ہے وہ مری شانِ عظیم
کرتے آتے ہیں جسے سب تسلیم

جڑ سمجھتے ہیں خوشی کی مجھ کو
میری عظمت نہیں باور تجھ کو

تُو بتا فخر ہے تجھ میں وُہ کیا
جس نے مجھ سے تجھے گمراہ کیا

وقت نے سُن کے کہا: اے دولت!
شک نہیں اس میں ذرا اے دولت!

ساری تُو خوبیوں کی جڑ ہے، مگر
اپنی جڑ کی نہیں کچھ تجھ کو خبر

تُو جو اپنے پہ ہے نازاں اتنی
اپنی ہستی سے ہے غافل کتنی!

کیجیے فرض تجھے گر چشمہ
تو ہُوں اس چشمہ کا میں سرچشمہ

میں ہوں یا تُو ہے اساسِ امکاں
پہلے دریا ہے کہ مچھلی، ناداں!

تُو جو کھیتی ہے تو رقبہ مَیں ہُوں
تو جو موتی ہے تو دریا میں ہُوں

ہے سراپا یہ ترا گر عطر آگیں
میں ہوں اُس عطر کی واللہ زمیں

ہے عبث تجھ کو تفوّق کا خیال
تُو ہے گر مال، تو میں راس المال

جن کے قبضے میں ہوں مَیں اے دولت
تجھ پہ رکھتے ہیں وہ دستِ قدرت

لاکھ بار اُن سے اگر بھاگے تُو
بڑھ کے جا سکتی نہیں آگے تُو

اُن کی مُٹھی میں ہے تُو اے دولت
طائرِ رشتہ بپا کی صورت

نہ کہ مَیں جس کا بدل ہے مفقود
جس کا نایاب ہے عالم میں وجود

کھو کے مجھ کو کوئی پاتا نہیں پھر
جا کے مَیں ہات سے آتا نہیں پھر

ایک پل میری اگر دیجیے گنوا
لیجیے ہاتھ اس سے ہمیشہ کو اٹھا

تُو اگر اپنی لُٹا دے ثروت
پل وہ ملتی نہیں پھر اے دولت!

ہیں اسی واسطے جو اہلِ تمیز
میری ایک ایک پل ہے اُنکو عزیز

میرے جو لوگ کہ ہیں قدر شناس
ہے مرا جاگتے سوتے انھیں پاس

جانتے ہیں حکماء و عرفا ... مجھ کو سرمایۂ دین و دُنیا
دل میں جن کے مری کچھ قدر نہیں ... اُن کی قسمت میں نہ دُنیا ہے نہ دیں
نہ کوئی کام ہو اُن سے انجام ... نہ ارادہ ہو کوئی اُن کا تمام
نہ اُنہیں دین کی دولت ہاتھ آئے ... اور نہ دُنیا کبھی اُن سے پتیائے
نہ ادا صوم ہو اُن سے نہ صلوٰۃ ... نہ ہو قدرت میں حج اُن کی نہ زکوٰۃ
نہ مدد اُن سے کچھ اپنی کی جائے ... نہ خبر اُن سے کسی کی لی جائے
گُن تو ہیں مجھ میں بہت سے اے دولت ... ہے مگر تنگ مجالِ فرصت
بس زیادہ نہیں مہلت مجھ کو ... بحث کی اب نہیں طاقت مجھ کو

اِس میں ہے میرا سراسر نقصان
کہ ہے انمول مری اک اک آن

---

(۱۱)

حقوقِ اولاد

۱۸۸۸ء

لاڈلا بیٹا[۱]

لاڈلا بیٹا تھا اک ماں باپ کا — جان ماں کی اور ایماں باپ کا
دیکھ اُسے ہوتے تھے دونوں باغ باغ — تھا وہی لے دے کے اس گھر کا چراغ
بال بیکا اس کا ہوتا تھا اگر — دل کو رہ جاتے تھے دونوں تھام کر
ہر طرح اُس کی رضا مقصود تھی — جان تک اُس کے لیے موجود تھی!
وقف تھی سب اُس پہ دولت اور مال — پر نہ تھا تعلیم کا اُس کی خیال!
روک ٹوک اُس کی کسی نے کی نہ تھی — باپ نے جھڑکی تک اس کو دی نہ تھی
گھور سے واقف نہ تھا اُستاد کی — شکل دیکھی ہی نہ تھی، جلاد کی
راہ سے مکتب کی کنتراتا تھا وہ — نام سے پڑھنے کے گھبراتا تھا وہ
لکھنے پڑھنے کی نہ تھی ترغیب کچھ — گوشمالی تھی نہ تھی تادیب کچھ
تربیت کے بدلے لاڈ اور پیار تھا — لہو و بازی میں سدا سرشار تھا
کھیل میں کرتا تھا برباد، آپ کو — اور کچھ پروا نہ تھی ماں باپ کو

---

۱ اس مثنوی کی سرخیاں مثنوی کے لاہور ایڈیشن طبع سوم میں موجود نہیں۔ البتہ طبع لکھنؤ میں موجود ہیں — فاضل

جانتے تھے گھر میں ہے دولت بہت ۔۔۔ لکھنے پڑھنے کی نہیں حاجت بہت
نوکری کرنی نہیں اس کو تلاش ۔۔۔ ہے اسی کے واسطے ساری معاش
گو رہے بے علم اور نادان یہ ۔۔۔ پر کسی صورت چڑھے پروان یہ
پیروی کی اِک خیالِ خام کی
فکر دونوں نے نہ کی انجام کی

اولاد کی باقاعدہ تربیت نہ کرنے کا انجام

جب ہوا وہ نازپروردہ جواں ۔۔۔ رنگ لائیں اُن کی بے پروائیاں
آپڑا اُس کا وُہی آخر کو رنگ ۔۔۔ لاڈلے بیٹوں کا جو ہوتا ہے ڈھنگ
سامنا ماں باپ کا کرنے لگا ۔۔۔ ہمسری کا اُن کی دم بھرنے لگا
حق تو اُن کے اُس سے کیا ہوتے ادا ۔۔۔ اور ناراض اُن کو وہ رکھنے لگا
تھیں ادائیں اُن کی اکثر ناپسند ۔۔۔ کارگر اُس کو ملامت تھی نہ پند
جہل و نادانی کی تھیں طغیانیاں ۔۔۔ رات دن کرتا تھا نافرمانیاں
اس کو صحبت تھی تو تھی اغیار سے ۔۔۔ اُس کی ملت تھی تو تھی انذال[1] سے
شہر میں "آوارہ" کہلاتا تھا وُہ ۔۔۔ چوک میں پاتا تھا جب پاتا تھا وُہ
خوف ہوتا تھا نصیحت کا جہاں ۔۔۔ رات دن کرتا تھا نافرمانیاں[2]
پند سے ناصح کی نفرت تھی اُسے ۔۔۔ سائے سے اچھوں کے وحشت تھی اُسے
گھر میں آ، اِک اِک سے لڑ مرتا تھا وہ ۔۔۔ باتوں باتوں میں بگڑ جاتا تھا وہ
نفس پر اپنے، نہ کر سکتا تھا جبر ۔۔۔ نام کو اس میں تحمّل تھا نہ صبر
دل پہ قابو، زینہار اس کو نہ تھا ۔۔۔ اور زباں پر اختیار اس کو نہ تھا

---

[1] ذلیل اشخاص۔

[2] یہ شعر مثنویات حالی طبع لکھنؤ میں نہیں ہے، طبع لاہور سے اضافہ کیا گیا ہے۔

جو وہ کرتا تھا اُسے بھرتے تھے سب　　اس سے چھوٹے اور بڑے ڈرتے تھے سب
اصل میں کچھ بد نہ تھی اُسکی سرشت　　کر دیے تھے جہل نے اطوار زشت
گو نہ مطلق آدمیت اس میں تھی　　پر جھلکتی قابلیت اُس میں تھی
بدچلن تھا پر نہ تھی طینت بُری　　فطرت اچھی تھی، مگر عادت بُری
چڑھ رہا تھا اس پہ بدصحبت کا رنگ　　لگ رہا تھا روشن آئینے کو زنگ
ذات میں اُس کی شرارت تھی نہ شر　　ہو گیا تھا بد، بدوں میں بیٹھ کر

باپ کی نصیحت

جب گئی حالت بگڑ حد سے سوا　　آ گیا دم ناک میں ماں باپ کا
باپ نے اِک روز گھر میں بیٹھ کر　　یُوں کہا بیٹے سے "اے جانِ پدر
یاد ہیں وہ دن بھی تم کو یا نہیں　　جبکہ یہ رعنائیاں تم میں نہ تھیں
جب خبر اپنی نہ تھی کچھ آپ کو　　جانتے تھے تم نہ ماں اور باپ کو
پاسباں تھے آپکے ماں باپ جب　　گوشت کا اک لوتھڑا تھے آپ جب
ہِل نہ تم سکتے تھے بے امدادِ غیر　　تھے نہ یہ اُڑنے کے پر چلنے کے پَیر
ہاتھ اور بازو، یہ سب بیکار تھے　　سخت بے بس تھے تم اور لاچار تھے
آنکھ سے چیپڑ[1] چھڑا سکتے نہ تھے　　مُنہ سے مکھی تک اُڑا سکتے نہ تھے
آگ پانی میں نہ تھی تم کو تمیز　　تھا تمہیں زہر اور امرت ایک چیز
رات دن یکساں سراسر تھا تمہیں　　دُھوپ اور سایہ برابر تھا تمہیں
بھوک میں بے چین ہو جاتے تھے یہ　　اپنی بے چینی سے تھے تم بے خبر
پیاس لگتی تھی تو روتے تھے سدا　　مانگنا پانی مگر آتا نہ تھا
کھا لیا جو کچھ دیا تم کو کھلا　　پی لیا جو کچھ دیا تم کو پلا!

---

[1] چیپڑ: آنکھ کا مَیل جو کوئے میں جمع ہو جاتا ہے۔ فاضل

تلخ و شیریں میں نہ تھا کچھ امتیاز — اس سے رغبت تھی نہ اس سے احتراز
یہ زباں زوری کہیں اصلا نہ تھی — تھی زباں منہ میں مگر گویا نہ تھی
سب کو رو رو کر جگاتے تھے مگر — اپنے رونے کی نہ تھی تم کو خبر
تھے نہ اپنے نفع و نقصاں کی سمجھ — درد کی سُدھ تھی نہ درماں کی سمجھ
دیتے تھے بہرِ شفا دارو اگر — سر پہ رو رو تم اُٹھا لیتے تھے گھر
گرمی اور سردی میں جب کپڑے تمہیں — ہم پنہاتے تھے تو کرتے تھے ضدیں
کیچڑ اور گارے سے نفرت کچھ نہ تھی — اور نجاست سے کراہت کچھ نہ تھی
واں اگر ہوتا نہ دم ماں باپ کا — کون رکھوالا تھا اس دم آپ کا
دل کا کہہ سکتے نہ تھے تم مدعا — بھوک کا رونا ہے یا ہے پیاس کا
بھوکے یا پیاسے اگر ہوتے تھے تم — کچھ نہ کہتے تھے مگر روتے تھے تم
ہم سمجھ لیتے تھے لیکن، مدّعا — بھوک کا رونا ہے یا ہے پیاس کا
پیاس میں مضطر جو پاتے تھے تمہیں — بن کہے پانی پلاتے تھے تمہیں
بھوک میں گر دیکھتے تھے بیقرار — دُودھ تھے تم کو پلاتے بار بار
رُوپ تھے معلوم سارے آپ کے — سب سمجھتے تھے اشارے آپ کے
تم کو کچھ تکلیف ہوتی تھی اگر — خود بخود تھی دل کو ہو جاتی خبر
چین ہو جاتا تھا سارا برطرف — پھرتے تھے بیتاب دوڑے ہر طرف
حالتیں سب تھے تمہاری جانتے — آپ کے تیور تھے ہم پہچانتے
ہوتے تھے بیمار، "دور از حال" جب — رات دن سہتی تھی ماں رنج و تعب
بارہا آنکھوں میں کٹ جاتی تھی رات — اِک بلا آتی تھی جب آتی تھی رات
ڈرتے تھے تم غیر عورت سے سدا — ماں کی گودی سے نہ ہوتے تھے جُدا
اور پری عورت سے تھے تم بھاگتے — دُودھ ہرگز غیر کا پیتے نہ تھے
پر کبھی تم سے دریغ اس کو نہ تھی — گر تمہارے کام آتی جان بھی
آج بیماری سے فرصت تھی نہ کل — آج چیچک کل تھا پسلی کا خلل

کرتے تھے سیانوں کی جا جا منتیں — مانتے تھے نت ہزاروں منتیں
ناز اُٹھاتے تھے طبیبوں کے سدا — ڈھونڈتے پھرتے تھے شربت اور دوا
عامل اور سیانوں نے جو مانگا دیا — منہ نہ پیسے کا کبھی ہم نے کیا
سخت بیماری کو جب پاتے تھے ہم — فکر کے مارے گھُلے جاتے تھے ہم
رات اور دن ماں الگ تھی بیقرار — باپ پھرتا تھا الگ زار و نزار
اللہ آمیں کر کے ہم لیتے تھے نام — کرتے تھے دم تم پہ سویرے صبح و شام
آنکھ پر آتا تھا گر مَیل آپ کے — دم پہ بن جاتی تھی ماں اور باپ کے
چاہتے تھے تم کو خوش آٹھوں پہر — تم بسیرے اور بنی یاں جان پہ
آپ کی خاطر اُٹھائے دُکھ پہ دُکھ — دس برس تک ایک دن پایا نہ سُکھ
ہم پہ گزریں کیسی کیسی سختیاں — گزریں دشمن پر نہ ایسی سختیاں
آئے گی خدمت ہماری یاد جب — ہو گئے تم خود صاحبِ اولاد جب
کی چھٹی ہم نے تمہاری جس طرح — کی ہو شاید ہی کسی نے اس طرح
مونڈن اور ختنہ کیا کس دھوم سے — شہر کو کھانا دیا کس دھوم سے
ہو چکی جب رسم بسم اللہ کی — رائے تھی اس وقت ایک اِک کی یہی
تم کو مکتب میں بٹھانا چاہیے — پڑھنے لکھنے پر لگانا چاہیے
پر نہ مانا دل نے اپنے زینہار — ڈالتے اس عمر میں تم پر یہ بار
ایک دو بار امتحاں کے طور پر — تم کو مکتب میں جو دیکھا بھیج کر
سارا دن بیکل تمہاری ماں رہی — اور پڑی تم میں ہماری جاں رہی
پھر تمہارا ہم نے جب دیکھا یہ حال — تم کو ہے جانے سے مکتب کے ملال
جاتے ہو جب بے مزا ہوتے ہو تم — گھڑیوں ضد کرتے ہو اور روتے ہو تم
جلد مکتب سے اُٹھا ہم نے لیا — آپ کے دل پر نہ مَیل آنے دیا
دل میں سمجھا ہو نہ جب بچے کو شوق — لطف اُسے پڑھنے میں آئے اور نہ ذوق
بھیجنا مکتب میں ہے اس کو ستم — باز آئے ایسے پڑھوانے سے ہم

اپنی رُت پر آپ بڑھ چڑھ لوگے تم ۔۔۔ وقت جب آئے گا خود پڑھ لوگے تم
دوستوں نے ہم کو سمجھایا بہت ۔۔۔ اپنے بیگانوں نے بہلایا بہت
"کھیل کی جب لگ گئی بچے کو چاٹ ۔۔۔ ہو گیا جی پڑھنے لکھنے سے اُچاٹ
کارگر ہو اس کو پند اور قید کیا ۔۔۔ اس کے پڑھنے کی ہے پھر اُمید کیا
یوں سنورنے کا نہیں زنہار یہ ۔۔۔ حق میں ہے زہر اس کے لاڈ اور پیار یہ"
پیار سے سمجھے تو یوں سمجھاؤ تم ۔۔۔ ورنہ اُٹھتے بیٹھتے دھمکاؤ تم
وقت یہ اغماض کرنے کا نہیں ۔۔۔ اب کا بگڑا پھر سنورنے کا نہیں"
کہتے تھے اپنے پرائے سب یہی ۔۔۔ آتی تھی آواز روز و شب یہی
تم کو لیکن ہم نے جھڑکی تک نہ دی ۔۔۔ جبر کرنے کو کبھی چاہا نہ جی
سن تمہارا جب زیادہ کچھ ہوا ۔۔۔ پھر پڑھانے کا ارادہ کچھ ہوا
اک معلم رکھا اور اک خوشنویس ۔۔۔ یاد ہو گی تم کو ان دونوں کی فیس
ایک کو پانچ ایک کو ملتے تھے دس ۔۔۔ یہ رہے نوکر برابر دو برس
اپنے اپنے فن میں تھے ہشیار یہ ۔۔۔ پر رہے دونوں سدا بیکار، یہ
گرچہ تھی تاکید دونوں کی شدید ۔۔۔ پر نہ دی تم نے کبھی ان کو رسید
تم کو کب فرصت تھی کود اور پھاند سے ۔۔۔ بھاگتے تھے تم نوشت اور خواند سے
مفت کی تنخواہ وہ پاتے رہے ۔۔۔ نام کو ہر روز یاں آتے رہے
تم نے آخر جب نہ کچھ پڑھ کر دیا ۔۔۔ دے کے کچھ، دونوں کو رخصت کر دیا
ہم نے یہ سمجھا[1] کہ کوشش ہے فضول ۔۔۔ ساری تدبیریں ہیں اپنی بے اصول
لکھنا اور پڑھنا ہے سب تقدیر کا ۔۔۔ تنگ ہے یہاں قافیہ تدبیر کا
جب ہوئے فضلِ الٰہی سے جواں ۔۔۔ سر پہ شادی کا چڑھا بارِ گراں
منگنیاں ہوتی ہیں اکثر قوم میں ۔۔۔ بیاہ ہوتے ہیں برابر قوم میں
کچھ بہت درکار زیور ہے نہ نقد ۔۔۔ ہوتے اک شربت کے پیالے پر ہیں عقد

---

[1] مثنوی طبع لاہور میں "یہ سمجھا کہ ہے کوشش فضول" — فاضل

گر کفایت سے چتے کچھ خرچ میں
بیاہ دیتے بس یونہی ہم بھی تمہیں

اپنے دل میں پر یہی ہم نے کہا
"ایک بیٹا اور وہ بھی لاڈلا"

گو تمام املاک بک جاتے مگر
خرچ کیجے بیاہ میں دل کھول کر

کی اگر یاں بھی کفایت پر نگاہ
اور ہم کو کون سے کرنے ہیں بیاہ

وقت یہ آتے نہیں پھر بار بار
کل خزاں ہے آج اگر یاں ہے بہار

ہے فراغت اور عسرت ساتھ ساتھ
کر لیں کچھ ہم بھی کہ اب چلتا ہے ہاتھ

ٹھان کر یہ جی میں دی شادی رچا
اپنے سے جو ہو سکا سب کچھ کیا

گر نہ یاد اپنا رہا تم کو بیاہ
شہر کے چھوٹے بڑے ہیں سب گواہ

رات دن جلسہ تھا ناچ اور رنگ کا
غلغلہ تھا ڈھولک اور مِردنگ[1] کا

دیکھنے آتی تھی خلقت جھوم جھوم
دور تک اس بیاہ کی پہنچی تھی دھوم

دور سب کے دل سے رنج و غم رہا
بیس دن تک یاں یہی عالم رہا

جانتے ہیں قوم کے بُرنا و پیر
آج تک دیتے ہیں سب اسکی نظیر

کی نہ دینے میں کفایت پر نظر
جس کو دینا تھا دیا دل کھول کر

اگلی اور پچھلی، پرانی اور نئی
شہر کی املاک ساری بک گئی

قرضہ تھا نقدی کا باقی جسقدر
گو ہوئی اس سے سبکدوشی مگر

رہن تھے جو گاؤں شادی میں کیے
آج تک بے چین ہوں اُن کے لیے

ہے بہت اُن کے چھڑانے کا خیال
پر بظاہر اُن کا چھٹنا ہے محال

اب بہت نازک ہے حالت باپ کی
پہنچی یہ نوبت بدولت آپ کی

مال اور جاں سے زیادہ کوئی چیز
آدمی کو یاں نہیں ہوتی عزیز

جان سے بھی ہم رہے خدمت گزار
مال بھی ہم نے کیا تم پر نثار

تم نے جو چاہا کھلایا وہ تمہیں
تم نے جو مانگا، پنہایا وہ تمہیں

گھوڑے چڑھنے کے لئے تم کو دیے
رکھے خدمت گار خدمت کے لیے

شوق جو اچھا بُرا تم نے کیا
ہم نے بھی تائید کی اس کی سدا

---

[1] ایک قسم کا ڈھول

خوب تم نے قدر کی ماں باپ کی — خوب خدمت کی ہماری داد دی
تھا نتیجہ جاں فشانی کا یہی؟ — تھا صلہ سوزِ نہانی کا یہی؟
باپ کا تم کو ادب اصلا نہیں — ماں کی خدمت کی تمہیں پروا نہیں
گھر میں دو دو دن نہیں آتے ہو تم — آتے ہو اک اک سے لڑ جاتے ہو تم
لوگ شاکی ہیں تمہارے جا بجا — خود بُرا کہہ کہہ کے سُنتے ہو بُرا
ہیں تمہارے سارے اوباشوں کے ڈھنگ — تم سے خوردوں اور بزرگوں کو ہے ننگ
ملنے والے ہیں تمہارے بادہ خوار — اور جواری ہیں تمہارے دوست دار
مُرغ ہم نے بھی لڑائے ہیں بہت — اور کبوتر بھی اُڑائے ہیں بہت
پر ہمارا حال تم جیسا نہ تھا — خبط تھا ہم کو بھی، پر ایسا نہ تھا
اپنے سب کاموں کو جب بھُگتا لیا — دو گھڑی اس میں بھی دِل بہلا لیا
تم تو دنیا اور دیں سب چھوڑ کر — ہو رہے انہیں دھندوں میں غرق آٹھوں پہر
ہے غرض ایسی ہی جو ہے تم کو دھت — فکرِ دُنیا ہے نہ فکرِ آخرت
ہم پہ سب ہنستے ہیں اشراف و رذیل — کر دیا تم نے بھی ہم کو اب ذلیل!
کر چکا تھا قرض پہلے ہی زبُوں — اور تم نے کر دیا عزت کا خوں
مُنہ نہیں ہوتا کسی کے رُوبرُو — خاک میں تم نے ملا دی آبرُو
بہتر اپنا یاں سے اُٹھ جانا ہے اب — رہ گیا پھر کیا گئی عزت ہی جب
باپ کا تم جانتے ہو اپنے حال — قرض میں جکڑا ہوا ہے بال بال
ہاتھ میں زر ہے نہ بازو میں ہے زور — مار کر فکروں نے کر ڈالا ہے چور
کام کی باقی نہیں اپنے میں تاب — مدتوں سے دے چکی ہمت جواب
گود میں لٹکاتے بیٹھے پاؤں ہیں — جا کے اب بن میں بساتے گاؤں ہیں
آپ میں ہوتا اگر کچھ حوصلا! — آدمیت کا تھا اب یہ مقتضا
سر پہ لیتے اپنے گھر کا بوجھ ٹک — باپ کو فکروں سے کر دیتے سبک
ہم رہے جیسے فدا تم پر مدام — تم بڑھاپے میں ہمارے آتے کام

ہم رہے اب تک تمہارے سرپراہ — اب ہمارے بنتے تم پشت و پناہ
ہم بھی یاں سُکھ پاتے کچھ اولاد کا — نام چلتا دیکھتے اجداد کا
پر خُدا کو تھا یہی منظور آہ — ہوتے وارث کے ہو گھر اپنا تباہ
جب کریں دُنیا سے آہنگِ سفر — ہم پھرا گھر جائیں ویراں چھوڑ کر
خیر اب ہم کو تو یاں رہنا ہے کم — کوئی دن کے اور ہیں مہمان ہم
پر تمہیں ہے کاٹنی ہے اک عمر یاں — ہو ابھی فضلِ الٰہی سے جواں
اب بھی اپنی حرکتوں سے باز آؤ — ڈھیل پہ بازیِ دوراں کی نہ جاؤ
بس گئیں حد سے گزر رُسوائیاں — کب تلک آخر یہ بے پردائیاں
نازو نعمت کا زمانہ ہو چُکا — خوابِ غفلت کا زمانہ ہو چُکا
گردشِ گردُوں ہے ہر دم گھات میں — شاطرِ دوراں ہے فکرِ مات میں
ہاتھ سے جاکر نہیں آتا ہے وقت — دیکھو بھائی ہاتھ سے جاتا ہے وقت
کر رہے اب بھی یونہی تم نادُرست — خود زمانہ تم کو کر دے گا درست
گردشیں دیں گی نکال ایک ایک بَل — ٹھوکریں کھا کھا کے جاؤ گے سنبھل
پھر سنبھلنا واں یہ کس کام آئے گا — جب سنبھلنے سے نہ سنبھلا جائے گا
ہوگی اُڑنے کی ہوس تم کو مگر! — ہوں گے اُڑنے کے نہ اس دم بال و پر
عقل ہوگی پر نہ ہوگا اقتدار — عزم ہوگا پر نہ ہوگا اختیار
جبکہ گیتی رنگ یہ دکھلائے گی — تب ملامت باپ کی یاد آئے گی

بیٹے کا جواب

باپ یہ سب کر چکا تقریر جب — سر جھکا کر از رہِ شرم و ادب
عرض کی بیٹے نے ارشاد آپ کا — قبلۂ عالم! سراسر ہے بجا
باپ کی اور والدہ کی شفقتیں — آخری دم تک نہ بھولیں گی ہمیں

حق ہیں سب سینے میں مضمر آپ کے — نقش ہیں احسان دل پر آپ کے
میری جو دلجوئیاں کیں آپ نے — وہ نہ کی ہوں گی کسی ماں باپ نے
اچھے سے اچھا کھلایا آپ نے — اچھے سے اچھا پہنایا آپ نے
جان و دل ہم پر فدا کرتے رہے — ناز برداری سدا کرتے رہے
ہے بڑے افسوس کا لیکن مقام — شفقتیں کچھ آپ کی آئیں نہ کام
وہ محبت اور نوازش آپ کی — حق میں اپنے زہر قاتل ہوگئی
خدمتِ عالی میں (گستاخی معاف) — عرض کر سکتا نہیں میں صاف صاف
یہ یہاں ہو بات کہنے کا محل — واں نہیں خاموش رہنے کا محل
گو کہ ہوں میں سر بسر تقصیر وار — مجھ سے ہے نوعِ بشر کو ننگ و عار
دھوم ہے میری بدی کی جا بجا — عیب ہے مجھ سے بزرگوں کو لگا
کو بکو آوارہ صبح و شام ہوں — شہر میں رُسوا ہوں اور بدنام ہوں
بے ہنر مجھ سے نہیں ہوتے کہیں — پر مری تقصیر کچھ اس میں نہیں
اُٹھے ہم جیسے اُٹھایا آپ نے — بن گئے جیسے بنایا آپ نے
کہتے ہیں "اخبار" میں آیا ہے یہ — مخبرِ صادق نے فرمایا ہے یہ
"اصل فطرت میں ہیں سب بچے رشید — غیب سے آتے ہیں سب بنکر سعید
پھر اسی رستے پہ بڑھ جاتے ہیں وہ — رُخ جدھر ماں باپ کا پاتے ہیں وہ
آئے تھے ہم جستجو میں راہ کی — تھی فقط درکار ہم کو رہبری
آپ نے جو راہ دی ہم کو بتا — ہم نے لی وہ راہ بے چون و چرا
آپ کے انعام اور احسان سب — یوں اگر کہیے تو لوں میں مان سب
پر اگر انصاف کچھ فرمائیں آپ — اس طرح مجھ کو نہ پھر شرمائیں آپ
ذکر بچپن کا جو فرماتے ہیں آپ — اپنے احسانوں سے شرماتے ہیں آپ
ہاں مقرر مامتا ماں باپ کی — حق میں بچوں کے ہے اک نعمت بڑی
گر نہ ہو ماں باپ کو اُن کا خیال — پرورش پانا ہو بچوں کا محال

پر نہیں دخل اس میں کچھ انسان کا
اس میں ہے ماں باپ کا احسان کیا

جان دے پانی اگر کھیتی میں ڈال
یا وہ کر دے خشک پودوں کو نہال

اِس میں پانی کا نہیں کچھ اختیار
ہے یہ خاصیت عطائے کردگار

کچھ نہیں تخصیص یاں انسان کی
ہے یہی خصلت ہر اک حیوان کی

جانور بھی جو نہیں رکھتے تمیز
سب کو بچے اپنے ہوتے ہیں عزیز

بھوک میں لیتے ہیں سب اُن کی خبر
پیاس میں کرتے ہیں سب حلق انکا تر

زد میں جب دشمن کی پاتے ہیں انہیں
زد سے دشمن کی بچاتے ہیں انھیں

آنکھ سے اوجھل وہ ہو جاتے ہیں جب
ڈھونڈتے پھرتے ہیں ہر سُو مضطرب

ہے غرض اُلفت وہی حیوان کو
لاگ جو بچوں سے ہے انسان کو

دی ہے آگ اِک دل میں قدرت نے لگا
جس سے دل بس میں نہیں ماں باپ کا

جب کہ قابو میں نہیں رہتا ہے دل
مانتے ہیں دل کی جو کہتا ہے دل

فکر میں گھلنا سدا اولاد کے
جھیلنے دُکھ بر ملا اولاد کے

کچھ خوشی ماں باپ کے دل کی نہیں
پر کریں کیا، مانتا دل ہی نہیں

وہ تو کرتے لاکھ بار اُن سے گریز
کیا کریں، ہے آتما کی آنچ تیز

اُس خدا نے، ذات ہے جس کی حکیم
جس کی حکمت اور حکومت ہے قدیم

ہوش خوردوں کو نہیں جب تک دیا
ان کا ضامن ہے بزرگوں کو کیا

تا کہ بے ہوشی میں لیں اُن کی خبر
جو کسی اُن کی کریں آٹھوں پہر

ہوں اگر بھوکے تو کچھ اُن کو کھلائیں
ہوں اگر پیاسے تو کچھ اُن کو پلائیں

جاگتے سوتے ہوں اُن کے پاسباں
بیٹھتے اُٹھتے ہوں اُن پر جانفشاں

ان کو بیکل دیکھ کر ہوں بے قرار
اُن کی بیماری میں ہوں تیمار دار

بے بسی کے دن نکلواتا ہے یُوں
اپنے مدہوشوں کو پلواتا ہے یُوں

ہر بشر کو دی ہے مہر اولاد کی
اِس طرح دُنیا ہے، یہ آباد کی

گر نہ ہو یہ مامتا اِنسان میں
خانماں ویراں ہو سب اک آن میں

اس سے بچ سکتا کوئی انساں نہیں
اِس میں کچھ اَولاد پہ احساں نہیں

جب کہ دُکھتا ہے کوئی عضوِ بدن
سارے ہو جاتے ہیں بیکل مرد و زن

کرتے تدبیر ہو سکتی ہے جو
درد کی تکلیف کھو سکتی ہے جو

درد کی جب تک کسک جاتی نہیں
کچھ کیے بن ان کو بن آتی نہیں

ہے یہی بالکل مثال اَولاد کی
کیونکہ ہے جزوِ بدن اَولاد بھی

کل سے ان کی کل سدا پاتے ہیں دل
دُکھ سے اُن کے سب کے دُکھ جاتے ہیں دل

پیاس میں بچّوں کو روتا دیکھ کر
کیا کریں پانی نہ دیں ان کو اگر

بھوک میں جب رو ئیں بچے زار زار
چھوڑ دیں کس طرح ان کو بے قرار

ان پہ گر سختی گذرتی ہے ذرا
ان سے یاں دو چند ہوتی ہے سوا

ان کا خوش جس بات سے ہوتا ہے جی
حصر[ل] ہے اس بات پر اُن کی خوشی

اُن کی کلفت سے ہے یلا ان کے لیے
ان کی فرصت سے ہے غذا ان کے لیے

طبع انساں کا ہے یہ جب اقتضا
کیا کرے گر ہو نہ بچّوں پر فدا

اپنی راحت خوش نہیں آتی کسے
اپنی آسائش نہیں بھاتی کسے

جبکہ مُصْرِف دُودھ کا کوئی نہ پائیں
کیوں نہ مائیں اپنے بچّوں کو پلائیں

ان کو بن بچّوں کے نیند آئے نہ جب
کیوں نہ چھاتی سے لگا کر سوئیں سب

کس طرح غافل ہوں پھر اَولاد سے
جب نہ بن دیکھے ہو چین اولاد کے

کہتے ہیں بچّوں کو ہم کرتے ہیں پیار
اور دل کو اپنے دیتے ہیں قرار

ظاہرا اُن کی خوشی کرتے ہیں یہ
اور ٹھنڈا اپنا جی کرتے ہیں یہ

مار پہ ہاتھ اُن کی اُٹھتا ہے اگر
دل کو رہتا ہے قلق دو دو پہر

اس لیے رکھتے ہیں اُنکو پیار سے
کیونکہ دل دکھتا ہے اُن کی مار سے

پیار اُنہیں کرتے سب اپنے لیے
اُن کا دم بھرتے ہیں سب اپنے لیے

ایک شفقت میں ہے دوہری منفعت
پرورش اُن کی اور اپنی مصلحت

[ل] منحصر ہے، موقوف ہے کے معنی میں۔

چین پر اُن کے بھی ہو شاید نظر — ان سے چین اپنا مقدم ہے مگر
بھول کر بھی نام ان کا نہ لے — پر طبیعت چین یاں لینے بھی دے
شفقتیں ایسی ہی سمجھیں آپ سب — کرتے ہیں بچوں پہ جو ماں باپ سب
اب رہی شادی، چھٹی اور بیاہ کی — رسم مونڈن اور بسم اللہ کی
گو ہے یاں دم مارنا بے غیرتی — ناسپاسی اور کافر نعمتی
بات لیکن بے کہے بنتی نہیں — خواہ نفریں کیجے خواہ آفریں
شادیوں میں آپ نے جو کچھ کیا — میری تقریبوں میں جو جو کچھ دیا
تھا وہ سب کچھ اپنی عزت کے لیے — نیک نامی اور شہرت کے لیے
تھا بہانہ یہ، کہ ہے عقدِ پسر — تھی مگر اپنی نمائش پر نظر
ہر طرف مدح و ثنا تھی آپ کی — ہر زباں پر واہ وا تھی آپ کی
چپ تھے سارے خردہ گیر و نکتہ چین — سب یہ کہتے تھے کہ "حضرت آفریں"
دوست ہی کہتے نہ تھے بس واہ وا — دشمنوں نے بھی لیے تھے سر جھکا
معترف بیگانے اور اپنے تھے سب — تھا جہاں چرچا یہی تھا روز و شب
تھا ہمارا کام، اور نام آپ کا — بلکہ تھا سب نام اور کام آپ کا
یاں نہ ہم کو دھیان تک شادی کا تھا — اور نہ ارماں گھر کی آبادی کا تھا
بیاہ یا شادی کا جب سنتے تھے نام — تھا ہمیں ایک اک کا منہ تکنے سے کام
ہم کو تھا شادی سے ایسا ہی لگاؤ — بیاہ کا ہو جیسے اک گڈے کو چاؤ
آپ کے دل میں تھے کچھ ارماں بھرے — بیاہ اُٹھا کر وہ ہمارے سر دھرے
مفت ہم شرمندۂ احساں ہوئے — اور پورے آپ کے ارماں ہوئے
گھر میں جو نقدی تھی یا اسباب تھا — یا سہارا تھا کچھ اک جائداد کا
کی نہ حضرت نے نظرِ انجام پر — کر دیا قرباں سب اک نام پر
آپ کی تو نبھ گئی عزت کے ساتھ — ستّر سے بہتر عیش اور عشرت کے ساتھ
پر ہماری کس طرح ہوگی بسر — گھر میں دولت ہے نہ ہاتھوں میں ہنر

ہے ہمیں اب آفتوں کا سامنا — ہو گیا عزت کا مشکل تھامنا
کر دیا خوں زور و زر کا آپ نے — گھاٹ کا رکھا نہ گھر کا آپ نے
آپ کو ہوتا اگر منظور یہ — کاہشیں ہم سے رہیں سب دور یہ
جور گردوں سے نہ ہوں پامال ہم — بعد حضرت کے رہیں خوشحال ہم
شادیوں میں رائیگاں کھوتے نہ مال — اپنی شہرت کا نہ کرتے کچھ خیال
کھولتے ہم پر نہ در افلاس کے — چھوڑ جاتے کچھ ہمارے واسطے
ہم پہ احساں آپ یاں کرتے اگر — علم کی دولت سے کرتے بہرہ ور
کھل کر تعلیم میں دل کرتے خرچ — ہوتا کچھ ہوتا اگر کاموں میں حرج
علم کا تھا ہم کو بے شک شوق کم — کانپتے تھے نام سے پڑھنے کے ہم
بے خبر تقدیر کی گھاتوں سے تھے — بھاگتے ہم کام کی باتوں سے تھے
تھے نصیحت سے بزرگوں کی نفور — رہتے تھے ملنے سے ان کے دور دور
پاس عزت کا نہ ڈر ذلت کا تھا — پردہ آنکھوں پہ پڑا غفلت کا تھا
تھے مگر ہر طرح بس میں آپ کے — حکم سے باہر نہ تھے ماں باپ کے
ہم سے سرزد جب خطا ہوتی کوئی — یا کہ حرکت ناسزا ہوتی کوئی
گو کہ دل کڑھتا سزا سے آپ کا — دل پہ کرتے جبر، پہ دیتے سزا
آپ کی خفگی کا ڈر ہوتا اگر — تربیت کا کچھ نہ کچھ ہوتا اثر
گر وطن میں تربیت آساں نہ تھی — کچھ جدائی خارج از امکاں نہ تھی
سوچتے انجام کی بدبختیاں — کرتے فرقت کی گوارا سختیاں
بھیج دیتے گھر سے باہر چند روز — لیتے دھر چھاتی پہ پتھر چند روز
مصلحت پر کرتے الفت کو فدا — کچھ دنوں اپنے سے کر دیتے جدا
یاد سے اپنی بھلا دیتے ہمیں — پر کسی قابل بنا دیتے ہمیں
گر جدائی آپ کو آتی نہ راس — دل ہمارے یاد میں رہتا اداس
درد فرقت سے نہ کچھ گھبراتے آپ — دل بہلتا جس طرح بہلاتے آپ

شادیوں میں خرچ جو اُٹھا فضول
ہم کو آخر کیا ہوا اس سے حصول
تربیت میں اپنی وہ اُٹھتا اگر
ہم نہ ہوتے خوار، شاید اس قدر
گھر میں کچھ باقی نہ رہتا اپنے جب
چار سُو پاتے کھُلی راہِ طلب
ہاتھ میں ہوتا اگر کچھ بھی ہُنر
رہتے عزت سے نکل جاتے جدھر
اپنے حق جتنے بتائے آپ نے
ہم پہ جو احساں جتاتے آپ نے
یُوں تو ہیں وہ قابلِ تسلیم سب
کیونکہ ہے ہم کو یہی حکمِ اَدب
کرتے ہیں جب دل میں لیکن غور ہم
اپنا حصہ ان میں کچھ پاتے ہیں کم
یاد ہیں سب ہم کو احساں آپ کے
کچھ اُمیدیں تھیں، کچھ ارماں آپ کے
اپنی خوشیاں کرتے تھے پُوری مگر
تھی مصالح پر ہماری، کم نظر
ایسے احسانوں سے ہو دل شاد کیا
ہم بزرگوں کو کریں گے یاد کیا

بیٹے کی ندامت

باپ سے جوشِ جوانی میں پسر
باتیں یہ کہتے تو کہہ گزرا مگر
کہہ کے جی میں اپنے شرمایا بہت
جراَت بیجا سے پچھتایا بہت
گو دیئے الزام سب اپنے بڑا
پر نہ مٹ سکتا تھا حق ماں باپ کا
دے رہا تھا باپ کو ترک صاف صاف
کہہ رہا تھا دل مگر اس کے خلاف
دعوے احساں سے سبکدوشی کے تھے
پر دبی جاتی تھی گردن بوجھ سے
گو زباں بس میں نہ تھی نادان کی
پر گلے میں تھی کمند احسان کی
کر کے عذرِ شوخ چشمی باپ سے
گر پڑا قدموں پہ آکر باپ کے

دل جو اُمڈا دیر تک روتا رہا
متصل اشکوں سے مُنہ دھوتا رہا

باپ کی دوبارہ نصیحت

گو ہوئی تھی باپ کو خفت کمال
پر یہ دیکھا اُس نے جب بیٹے کا حال

جلد قدموں پر سے سر اس کا اٹھا
اپنی چھاتی سے لیا اُس کو لگا

پھر کہا بیٹے سے اے لختِ جگر
کیوں ہوئی تم کو ندامت اس قدر

تم نے جو الزام ہیں مجھ کو دیئے
اس سے بڑھ کر کیا خوشی ہو گی مجھے

شکر ہے اتنی تو ہے تم کو خبر
باپ نے رکھا ہے تم کو بے ہُنر

سب بُرے تم سے سلوک اس نے کیئے
جو بھلائی کی، وہ کی اپنے لیے

باپ تو کہنا ہی تھا تم کو بُرا
تم نے کر دی باپ کی ثابت خطا

چاہیے اِس کے سوا کیا باپ کو
باپ کے تم رہنما پیری میں ہو

پر مری جاں ہم تو ہیں پا در رکاب
آنے والی ہے اجل سر پر شتاب

فی الحقیقت گر ہوئی ہم سے خطا
حاصل اب اس کے جتانے سے ہو کیا

عمرِ رفتہ پھر ملے جب باپ کو
اس نصیحت پر عمل تب ہو تو ہو

جب کہیں بیٹا ہو پیدا دوسرا
عمر بھی خالق کرے اس کو عطا

اور رہے سر پر سلامت باپ بھی
بات بھی بگڑی نہ ہو پھر باپ کی

تب نصیحت ہو تمہاری سُود مند
ہو سکے تب باپ اس پہ کار بند

جب کہ یہ ممکن نہیں اے جانِ جاں
ہے ہمیں الزام دینا رائیگاں

سرزنش کا وقت ہی جب ہو چکا
سرزنش اب تم نے کی ہمکو تو کیا

رُت ہماری تو گئی ساری گُذر
ہو ابھی تم جوہرِ قابل مگر

غلطیاں سب باپ کی ہو جانتے
اپنے نیک و بد کو ہو پہچانتے

راہ پر چاہو تو آ سکتے ہو تُم
ہم نے جو کھویا ہے پا سکتے ہو تم

ہو گئی یا لغزش جو کچھ باپ سے
ہے تلافی اس کی ممکن آپ سے

تربیت بے جا کریں ہم، یا بجا　　تربیت ماں باپ کی ہے چیز کیا
نوجوانی کا نشہ چڑھتا ہے جب　　سب دھری رہتی ہے تعلیم او ادب
ہاں مگر جو عقل خود رکھتے ہیں یاں　　ٹھیک رہتے ہیں وہی ہو کر جواں
ہر کوئی بیج اپنا خود بوتا ہے خوب　　کام اپنا آپ ہی ہوتا ہے خوب
پہلے اپنا سوچ لو انجام تم　　دیتے رہنا پھر ہمیں الزام تم
ہم نے بچپن میں بگاڑا ہے، مگر　　اب تو تم عاقل ہو خود جاؤ سنور
اب بھی گر حالت نہ بدلی آپ کی　　آپ کی بھی پھر مثل ہوگی وہی
باپ نے بیٹے کو نالائق کہا　　بیٹا نالائق ہی سچ مچ بن گیا
تاکہ کہنا باپ کا جھوٹا نہ ہو　　نسبتِ نالائقی بے جا نہ ہو
ہے پسندیدہ اطاعت باپ کی　　پر نہ ایسی جیسی اس لڑکے نے کی

ہے اگر بیٹا! اطاعت اس کا نام
ایسی ناواجب اطاعت کو سلام

روٹی کیونکر میسّر آتی ہے

یہ کھاتے ہو جو تم ہر روز روٹی
بتاؤ کیونکر ہے تیار ہوتی

اگر آٹے کی پکتی ہے تو آٹا
بتاؤ ہے کہاں سے روز آتا؟

اگر آٹا یہ گیہوں کا ہے پستا
تو پھر یہ پیستا ہے کام کس کا

گیہوں کس طرح ہوتے ہیں میسّر؟
اور آتے ہیں کہاں سے اور کیونکر

کسانوں کا ہے یہ احسان ہم پر
کہ ہوتے ہیں گیہوں ہم کو میسّر

یہی پہنچاتے ہیں بندوں کو روزی
خدا کے گھر کا سمجھو ان کو مودی

انہیں کا کام ہے ہر فصل کی کاشت
انہیں کا کام ہے محنت کی برداشت

یہی بو کر ہم پہنچاتے ہیں ناج !
ہے اس میں ساری خلقت انکی محتاج

کساں اکثر اِدھر کے اور اُدھر کے
گیہوں لے آتے ہیں چھکڑوں میں بھر کے

جو بازاروں میں بیٹھے ہیں دوکاندار
وہ ان چھکڑوں کے ہوتے ہیں خریدار

گیہوں کا بھاؤ اک کر کے مقرر
دکانوں میں وہ اپنی لیتے ہیں بھر

پٹا رہتا ہے سب غلّہ سے بازار
جدھر دیکھو اُدھر غلّہ کا انبار

گیہوں ہم لوگ لیتے ہیں انہیں سے
روپے کے دو روپے کے دس روپے کے

تمہارا باپ ہے جو کچھ کماتا
اناج اس کا ہے وہ بھی مول لاتا

تمہاری ماں کو دے دیتا ہے لاکر
وہ ان کو چن پھٹک کر اور بنا کر

خود اپنے ہاتھ سے ہے پیس لیتی
لگا رکھی ہے اس نے گھر میں چکی

اسی چکی کا پیسا تھا وہ آٹا　　چڑھے پروان ہو تم جس کو کھا کھا .
وہ بے چاری ہمیشہ صبح ہوتے　　کہ جب تم بے خبر ہوتے ہو سوتے
جھٹ آٹا پیسنے جا بیٹھتی ہے　　عجب بندی خدا کی محنتی ہے
وہ ہے اس ہاتھ سے چکی چلاتی　　اور اس سے غلّہ پیہم ڈالے جاتی
جب اس کا ہاتھ تھک جاتا ہو دایاں　　بدل لیتی ہے تب وہ ہاتھ بایاں
کبھی گھبرا کے دل ہی دل میں اپنے　　خدا کا نام وہ لگتی ہے جپنے
کبھی دل کو خدا سے لو لگا کر　　تسلّی دیتی ہے وہ گیت گا کر
جب آٹا پیس چکتی ہے تو گویا　　سمجھتی ہے بڑا گڑھ میں نے جیتا
پھر آٹا چھان کر بھوسی جدا کر　　اسے بھرتی ہے مٹکے میں اٹھا کر
لگی پھر گوندھنے آٹا چھپا چھپ　　اور اس میں مارنے مکّی شپا شپ
وہ یوں آٹے کو ہے دیتی لچکتی　　کہ گویا لڑ رہی ہے اس سے کشتی
جب آٹا گوندھ چکتی ہے تو لے کر　　توا، دیتی ہے رکھ چولھے کے اوپر
بناتی ہے گندھے آٹے کے پیڑے　　کہ ہو جس طرح سے جلدی نبیڑے
وہ چھپ چھپ پھر پکا لیتی ہے روٹی　　چپاتی خواہ ہلکی خواہ موٹی
ذرا دیکھو تو کوئی اس کی پھرتی　　توے پر دم میں ڈالی اور الٹی
پکا کر، ریندھ کر، کھا کر، کھلا کر　　ہوئے جھوٹے جو باسن دھو دھلا کر
لیا کچھ اور گھر کا کام دھندا　　یہی ہے اس کا صبح و شام دھندا
کبھی ایندھن نہیں ہوتا میسّر　　تو لے کر وہ طباق آٹے کا سر پر
پہنچتی ہے بچاری سیدھی تندور　　نہیں جو اس کے گھر سے کچھ بہت دور
وہ بھٹیارا جو ہے تندور والا　　سب آٹا اس سے پکواتے ہیں لا، لا
لگا رہتا ہے صبح و شام تانتا　　اک آتا ہے دکاں پر ایک جاتا
وہ باندھے بیٹھا رہتا ہے لنگوٹی　　لگاتا ہے بہت پھرتی سے روٹی
گھڑی ہاتھوں پہ پھیلائی، بڑھائی　　رفیدے سے پر دھری اور چپٹ لگائی .

دکھاتا ہے وہ یوں ہاتھوں کے انداز — کہ جیسے کوئی پھرتیلا پٹے باز
وہ ہے یوں پیٹتا پیڑوں کو پیہم — کہ گویا ٹھونکتا ہے پہلواں خم
اُترتی روٹیاں ہیں باری باری — وہ گرما گرم سوندھی اور کراری
اُتر سب روٹیاں جب آئیں پک کے — تو دسترخوان سے لاتی ہے ڈھک کے
ادھر تم ساری بہنیں اور بھائی — ہو اس دھن میں کہ آئی ماں اب آئی
تکا کرتے ہو بیٹھے راہ ماں کی — سمجھتے کچھ نہیں پر چاہ ماں کی
وہ کرتی رہتی ہے تم سب کی خدمت — نہیں ملتی اُسے مرنے کی فرصت
یہی رہتا ہے دن رات اُسکو رونا — پکانا۔ رینڈھنا۔ سینا۔ پرونا
رُندھی رہتی ہے تم بچوں میں دن رات — کرے کبھی تو کسی سے کیا کرے بات
نہ ہوش اچھے کا اُس کو اور بُرے کا — نہ بدڑا پہننے اور اوڑھنے کا
کہیں پڑ رہنا، فارغ جبکہ ہونا — کوئی سونے میں داخل ہے یہ سونا؟
ڈھلا دن اور چڑھا سر کھانے کا فکر — تمہارے باپ کا گھر آنے کا فکر
سویرے کا وہ نکلا نکلا گھر سے — پھرے گا شام کو جب کام پر سے
تو اس کو دیکھتے ہی آپ سے آپ — بڑے اور چھوٹے ہو جائیں گے چپ چاپ
قدم رکھے گا جو نہیں گھر کے اندر — سنبھل بیٹھو گے تم سب اس سے ڈر کر
اور اماں چھوڑ کر پھر سوئی تاگا — لگے گی لینے اُس کا آگا تاگا
وہ سستانے نہیں پاتا کہ لا کے — بچھا دیتی ہے دسترخوان آ کے
گھڑی تم کو گھڑی جھلتی ہے پنکھا — گھڑی پانی پلاتی ہے وہ لا لا
دیئے جاتی ہے تم سب کو وہ سالن — رہے اپنے لیے گو کچھ نہ لاون
جو بچ رہتی ہے نیچے ہڈی بوٹی — لگا کر اُس سے کھا لیتی ہے روٹی
اُسے تم کو کھلانے سے ہے مطلب — نہیں کچھ اپنے کھانے سے ہی مطلب
اگر کھانے میں آئی تم کو لذت — تو سمجھو لگ گئی نیگ اس کی محنت
نہ پکا گر مزے کا تو نگوڑی! — ہوئی جاتی ہے دل میں تھوڑی تھوڑی

بھلا ماں کے سوا کس سے بن آئے؟ — نہ کھاتے آپ اور تم کو کھلائے
تمہیں کیا فکر ان جھگڑوں کا بھائی — کہ ملتی ہے تمہیں پکی پکائی
پکانے سے نہ پکوانے سے مطلب — اگر ہے تم کو تو کھانے سے مطلب
ذرا سی دیر کھانے میں اگر ہو — تو تم رو رو کے گھر سر پہ اٹھا لو
نہ اُلفت باپ کی تم جانتے ہو؟ — نہ ماں کی مامتا پہچانتے ہو؟
نہ ان کی محنتوں کی ہے خبر کچھ؟ — نہ اُن کی جانفشانی پر نظر کچھ؟
نہیں کر سکتے حق اُن کا ادا تم — کرو اُن پر سے گر جاں بھی فدا تم
دل و جاں سے کرو تم اُن کی عظمت — بجا لاؤ ادب سے اُن کی خدمت
سمجھ لو اس سے ماں کی قدر و عظمت — کہ اس کے پاؤں کے نیچے ہے جنّت
تمہیں محنت سے پالا اور پوسا — ستایا تم نے پر اُس نے نہ کوسا
سبق ماں باپ سے یہ سیکھ رکھو — بڑے ہو کر یہی کرنا ہے تم کو
مزا جب ہے کہ ہاتھ اُن کا بٹاؤ — بڑے ہو کر تم اُن کے کام آؤ
کبھی ہونا نہ تم سست اور کاہل — لگانا اپنے اپنے کام میں دل

نہ ڈھیلی چھوڑنا تم اپنی ڈوری
سمجھنا جی چرانے کو بھی چوری

"فارسی میں مبداء فیاض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد وضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر"

مرزا غالب کو اپنی فارسی زبان کی محنت پژوہی اور جسگرکاوی پر ناز تھا۔ حتیٰ کہ ایک معاصرانہ طعن کے جواب میں کہہ اُٹھے تھے:

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ منست

اس خیال میں اُنہیں اس درجہ غلو پیدا ہو گیا تھا کہ اپنے کلیاتِ فارسی کو الہامی صحیفہ اور ایزدی کتاب قرار دیتے تھے۔ چنانچہ جب ۴۱ سال کی عمر میں اِس کی ترتیب سے فارغ ہوئے تو خاتمے میں اس نغمے پر تان توڑی تھی:

گر شعر و سخن بدہر آئیں بودی
دیوان مرا شہرتِ پرویں بودی
غالب اگر ایں فنِ سخن دیں بودی
آں دیں را ایزدی کتاب ایں بودی

کلیاتِ غالب (فارسی)

"ہسٹری آف اُردو لٹریچر" رام بابو سکسینہ نے انگریزی میں تصنیف فرمائی۔ اس سے زیادہ تر یہ غرض تھی کہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ اس سے مستفیض ہو مگر اوّل سے آخر تک اس کتاب کے مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ مصنّف نے جس کاوش، جس کوشش، زورِ مطالعہ اور وسعتِ نظر سے اس میں کام لیا ہے اور اسلوبِ بیان اور تنقید وغیرہ میں جو صفائی مدِنظر رکھی ہے اور شاعروں کے کلام کا توازن کر کے ان پر جیسی صحیح بیباکانہ اور بے لاگ رائیں قائم کیں ہیں، وہ اس کتاب کو ہر حیثیت سے منفرد صورت میں پیش کرتی ہیں۔ فاضل مصنف نے کتاب کی ترتیب میں اس روش کا خیال رکھا ہے۔ جو ادب انگریزی کے مشہور مصنفین پروفیسر سینٹس بری اور گاسی وغیرہ نے اپنی تصانیف میں اختیار کی ہے جس سے علاوہ جدّتِ ترتیب اور مخصوص اسلوبِ بیان کے یہ فائدہ بھی ہوا کہ کتاب ان اصحاب کے لیے بہت مفید ہو گئی جنہوں نے بی۔ اے یا ایم۔ اے کی ڈگری یا پی سی ایس کے واسطے اُردو ادب لیا ہو۔

تاریخ ادبِ اردو

اُردو ترجمہ: ہسٹری آف اُردو لٹریچر از رام بابو سکسینہ

مترجم: مرزا محمد عسکری، بی۔ اے

خوبصورت لکھائی چھپائی، دلکش گرد پوش، سفید کاغذ، باتصویر مجلد ۱۸/- نیوز پرنٹ غیر مصوّر -/۱۰

شیخ مبارک علی تاجر و ناشر کتب اندرون لوہاری دروازہ، لاہور